الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے ——————
اگر آپ دوسروں سے آگے نہیں بڑھتے
تو دوسرے آپ سے آگے بڑھ جائیں گے

اپریل ۱۹۸۷
شمارہ ۱۲۵

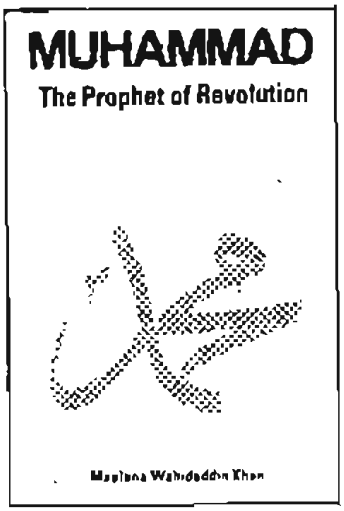

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi-110013

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۵ — اپریل ۱۹۸۷

فہرست

	صفحہ		صفحہ
دو نمونے	۲	دین میں غلو	۱۸
عبرت ناک	۳	فیض بقدر استعداد	۱۹
دعوت کے آداب	۴	ذہنی ارتکاز	۲۰
علم کی قیمت	۵	یک طرفہ اقدام کی ضرورت	۲۱
دریافت کا طریقہ	۶	کم سمجھنا	۲۳
کامیابی کا راز	۷	بامعنی کائنات	۲۴
دوسروں کے ذمہ	۸	یہودی کردار	۲۶
ایک مشورہ	۹	یہ فرق کیوں	۲۷
ملت کی کہانی	۱۰	ایک سفر	۲۹
دعوتی عمل	۱۳	دین سے دور	۴۴
اتحادِ ملت	۱۶	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۵
خاموشی ضروری ہے	۱۷	ایجنسی ایک پروگرام	۴۸

دو نمونے

یہ دہلی کا واقعہ ہے۔ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر میں مسجد کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ ایک صاحب بول اٹھے۔ وہ بھی میری طرح نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکل رہے تھے: "آپ نے دیکھا نہیں اس آدمی کو" اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنا شروع کیا "نماز پڑھ رہا تھا اور کہنیاں یہاں تک کھلی ہوئی تھیں۔ شیطان بھی خوش اور رحمان بھی خوش۔ اللہ بچائے ایسے نمازیوں سے۔" وہ کہہ رہے تھے اور حال یہ تھا کہ نفرت اور حقارت ان کے لفظ لفظ سے ٹپک رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو خدا کی مسجد سے تواضع کے بجائے کبر کا سبق لے کر نکلتے ہیں۔ جن کو کہنیاں کھلنے کا مسئلہ معلوم ہے، مگر یہ مسئلہ ان کو معلوم نہیں کہ مسلمان پر مسلمان کا احترام فرض ہے۔ ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے، اور اس کا ذکر نفرت اور حقارت کے ساتھ کرے۔

یہ تو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا طریقہ ہے۔ اب دیکھئے کہ اس طرح کے معاملات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔

صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ایک مسلمان کا واقعہ نقل ہوا ہے۔ وہ نومسلم تھے اور ابھی نماز کے آداب سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ کی مسجد نبوی میں نماز باجماعت میں شریک ہوا۔ اور کسی وجہ سے نماز کے درمیان کچھ بول پڑا۔ نمازیوں نے مجھ کو ترچھی نظر سے دیکھنا شروع کیا گویا کہ میں نے بہت غلط کام کیا ہے۔ کسی نے میرے زانو پر ہاتھ مار کر مجھ کو چپ کرنا چاہا۔ اس کے بعد جب نماز ختم ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت نرمی کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ مذکورہ راوی اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فواللّٰہِ ما رأیتُ أحسَنَ منہ مُعلِماً قبلہ ولا بعدہ۔ ما قھرنی وما شتمنی وقال انّما المساجد لذِکرِ اللّٰہ۔ لا یصلح فیھا من کلام الناس

خدا کی قسم، آپ سے زیادہ اچھا معلم میں نے نہیں دیکھا نہ آپ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد۔ آپ نے مجھ کو نہ جھڑکا اور نہ برا کہا۔ آپ نے صرف یہ فرمایا کہ مسجدیں اللہ کی یاد کے لیے ہیں مسجدوں میں انسانی گفتگو مناسب نہیں۔

عبرت ناک

مسلمان اسپین میں ۹۲ ھ میں داخل ہوئے اور وہاں حکومت قائم کی۔ آٹھ سو سال تک بااقتدار رہنے کے بعد ۸۹۷ ھ میں وہاں سے ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس لمبی مدت کا بڑا حصہ عیسائی طاقتوں سے لڑنے میں گزرا۔ آخری دور میں مسلمانوں کی حکومت غرناطہ کے محدود علاقہ میں رہ گئی تھی۔ اور اسپین کے وسیع حصہ پر فرڈیننڈ دوم (۱۴۵۲-۱۵۱۶) کی حکومت قائم تھی۔

۸۷۰ ھ میں سلطان ابوالحسن غرناطہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس وقت سلطنت غرناطہ کا رقبہ کم ہو کر صرف چار ہزار مربع میل باقی رہ گیا تھا۔ جب کہ شاہ فرڈیننڈ کی حکومت کا رقبہ تقریباً سوا لاکھ مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔ فرڈیننڈ نے مطالبہ کیا کہ سلطان ابوالحسن اس کو خراج دینا منظور کرے۔ سلطان ابوالحسن نہایت بہادر آدمی تھا۔ اس نے عیسائی بادشاہ کو جواب میں لکھا کہ: غرناطہ کے دارالضرب میں اب سونے چاندی کے سکے ڈھالنے کے بجائے لوہے کی تلواریں تیار ہو رہی ہیں تاکہ تم عیسائیوں کی گردنیں ماری جائیں"۔ اس کے بعد دونوں بادشاہوں میں جنگ چھڑ گئی۔ سلطان ابوالحسن نے ان جنگوں میں بار بار شاہ فرڈیننڈ کو شکست دی۔ تاہم آخری فتح فرڈیننڈ کو ہوئی۔

اس کا سب سے بڑا سبب خود سلطان ابوالحسن کا بیٹا ابوعبداللہ محمد تھا۔ ۲۷ جمادی الاول ۸۸۷ ھ کو لوشا کے میدان میں سلطان ابوالحسن نے فرڈیننڈ کی فوجوں کو زبردست شکست دی۔ مگر جب وہ دشمن کو شکست دے کر واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے ابوعبداللہ محمد نے غرناطہ پر قبضہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کے بعد سلطان اور باغی شہزادے میں جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ ۲ جنوری ۱۴۹۲ء (۸۹۷ ھ) کو عیسائی بادشاہ نے آخری طور پر سلطنت غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔

مسلمانوں کو ماضی میں جتنی شکستیں ہوئی ہیں، سب آپس کے اختلافات کے نتیجہ میں ہوئی ہیں۔ مگر تاریخ اسلام کا یہی وہ سب سے بڑا واقعہ ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو سب سے کم معلوم ہے۔ ماضی کی طرح آج بھی وہ اس طرح آپس میں لڑ رہے ہیں جیسے کہ انھوں نے اپنے ماضی سے کچھ سبق نہیں سیکھا۔

دعوت کے آداب

حِمیَر قدیم عرب کا ایک طاقتور قبیلہ تھا۔ اس نے موجودہ یمن کے علاقہ میں کئی سو سال تک حکومت کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد جب اطرافِ عرب کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط بھیجے تو حِمیر کے شاہی خاندان کے افراد (حارث، مسروح، نعیم بن کلال) کے نام بھی دعوتی مکتوب روانہ فرمایا۔ اس واقعہ کی تفصیلات طبقات ابن سعد، البدایہ والنہایہ اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

مذکورہ دعوتی مکتوب کو لے کر جو صحابی یمن گئے تھے ان کا نام عیاش بن ربیعہؓ ہے۔ حضرت عیاش کو اپنا مکتوب حوالہ کرنے کے ساتھ آپ نے کئی خصوصی ہدایات بھی انھیں دی تھیں۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ راستہ میں اَعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھتے ہوئے جائیں اور جب منزل پر پہونچیں تو پہلے دو رکعت نماز ادا کریں اور اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کریں۔ اس کے بعد ان لوگوں کے یہاں جاکر انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتی مکتوب پیش کریں (طبقات ابن سعد، جلد اوّل)

حضرت عیاشؓ نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے راستہ میں اَعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنے کا اہتمام کیا۔ اور پھر دو رکعت نماز پڑھ کر اپنے اور مدعو کے حق میں دعائیں کیں۔ اس کے بعد وہ ان کی قیام گاہ میں داخل ہوئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تینوں اشخاص غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کرلیا۔ یہ واقعہ ۹ھ کا ہے۔

اس واقعہ سے داعی کا اخلاق معلوم ہوتا ہے۔ جب ایک شخص کسی بھٹکے ہوئے آدمی کے سامنے حق کی دعوت پیش کرے تو اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کی انا جاگ اُٹھے اور وہ بُرے طریقہ سے اس کا جواب دے۔ ایسے موقع پر داعی کو چاہیے کہ وہ مکمل طور پر اشتعال سے بچے۔ اور اگر بالفرض اس کے اندر جوابی اشتعال پیدا ہو تو اس کو شیطانی فعل سمجھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے۔ داعی کے دل میں مدعو کی اس حد تک خیر خواہی ہونی چاہیے کہ وہ اس کی ہدایت کی دعا کرنے لگے۔ وہ آخری حد تک اس کی ہدایت اور اصلاح کا حریص بن جائے۔

علم کی قیمت

جناب عبدالرحمٰن انتولے (بیرسٹر ایٹ لا، اور سابق چیف منسٹر مہاراشٹر) نے ۵ فروری ۱۹۸۷ کی ملاقات میں ایک واقعہ بتایا۔ غالباً ۱۹۵۴ کی بات ہے۔ اس وقت وہ لندن کی کونسل آف لیگل ایجوکیشن میں قانون کے طالب علم تھے۔ ایک لکچر کے دوران ایک قانونی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے انگریز پروفیسر نے انھیں یہ واقعہ سنایا تھا۔

پروفیسر نے بتایا کہ ایک بڑا صنعتی کارخانہ چلتے چلتے اچانک بند ہوگیا۔ کارخانہ کے انجنیر اس کو دوبارہ چلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔ آخر ایک بڑے اکسپرٹ کو بلایا گیا۔ وہ آیا تو اس نے کارخانہ کا ایک راونڈ لیا۔ اس نے اس کی مشینیں دیکھیں۔ اس کے بعد وہ ایک جگہ رک گیا۔ اس نے کہا کہ ایک ہتھوڑا لے آؤ۔ ہتھوڑا لایا گیا تو اس نے ایک مقام پر ہتھوڑے سے مارا۔ اس کے بعد مشین حرکت میں آگئی اور کارخانہ چلنے لگا۔

مذکورہ اکسپرٹ نے واپس جاکر ایک سو پونڈ کا بل بھیج دیا۔ کارخانہ کے منیجر کو یہ بل بہت زیادہ معلوم ہوا۔ اس نے ایکسپرٹ کے نام اپنے خط میں لکھا کہ آپ نے تو کوئی کام کیا نہیں، یہاں آکر آپ نے صرف ایک ہتھوڑا مار دیا۔ اس کے لیے ایک سو پونڈ کا بل ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ براہِ کرم آپ ہمارے نمائندہ کو مزید اور زیادہ بہتر تفصیلات عطا فرمائیں:

Please furnish my client with further and better particulars.

اس کے جواب میں مذکورہ اکسپرٹ نے لکھا کہ میں نے جو بل روانہ کیا تھا وہ بالکل صحیح ہے۔ اصل یہ ہے کہ ۹۹ پونڈ اور ۱۹ شلنگ تو یہ جاننے کے لیے ہیں کہ مشین میں غلطی کیا ہے اور کہاں ہے۔ اور ایک شلنگ ہتھوڑا اٹھا کر مارنے کے لیے :

£ 99.19 to diagnose the disease and one shilling to pick up the hammer and to strike at the right spot.

اس دنیا میں سب سے زیادہ قیمت علم کی ہے۔ اسی طرح آخرت میں سب سے زیادہ قیمت معرفت کی ہوگی۔ جو شخص معرفت خداوندی میں جتنا بلند ہوگا اتنا ہی وہ آخرت میں بلند کیا جائے گا۔

دریافت کے ذریعہ

فن تعلیم کی ایک اصطلاح ہے جس کو اکتشافی طریقہ (Discovery method) کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ جین پائگے (Jean Piaget) اور جیروم برونر (Jerome Bruner) وغیرہ کی تحقیقات کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ اس طریقہ میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ طالب علم کو ہر بات بتائی نہ جائے، بلکہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہ اپنے دماغ کے استعمال سے باتوں کو خود جانے۔ یہ طریقہ مسئلہ حل کرنے پر زور دیتا ہے، اس میں استاد کی رہنمائی کو کم کیا جاتا ہے اور طالب علم کے لیے اس موقع کو بڑھایا جاتا ہے کہ وہ چیزوں کو اپنے آپ دریافت کرے :

> This method emphasizes problem-solving, minimizing guidance by the teacher and maximizing the student's opportunity for exploration and trial and error (EB-III/572).

بچوں کی تعلیم کے لیے یہ اصول انسانی فطرت کے مطالعہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ انسان کے اندر فطری طور پر یہ طاقت ور مادہ موجود ہے کہ وہ اپنے علم کو بڑھانا چاہتا ہے۔ مزید یہ کہ آدمی جو بات خود اپنی دریافت کے ذریعہ جانتا ہے وہی حقیقی معنوں میں اس کے ذہن کا جزء بنتی ہے۔ بتائی ہوئی باتیں اکثر بھول جاتی ہیں مگر دریافت کی ہوئی باتیں کبھی نہیں بھولتیں۔ آدمی کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے زیادہ دخل انھیں باتوں کا ہوتا ہے جن کو وہ خود جانے نہ کہ وہ جن کو اس نے دوسروں سے سن لیا ہو۔

یہی اکتشافی طریقہ دین میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن نے اپنے مطلوب انسانوں کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں (الذین یومنون بالغیب) غیب پر ایمان لانا کیا ہے۔ یہ دوسرے لفظوں میں، نامعلوم کو معلوم بنانا ہے۔ ایک چیز جو انسان کے شعوری علم سے باہر تھی اس کو شعوری علم کے دائرہ میں لے آنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اور عالم آخرت کو انسان کی نظروں سے چھپا دیا ہے۔ اب انسان کو اسے دریافت کرنا ہے۔ جو چیز غیب میں ہے اس کو شہود بنانا ہے۔ اسی کا نام ایمان ہے۔ اس ایمان میں جو شخص جتنا آگے ہوگا اتنا ہی وہ آخرت میں آگے رہے گا۔

کامیابی کا راز

ڈاکٹر سی وی رمن (۱۹۷۰ - ۱۸۸۸) ہندستان کے مشہور ترین سائنس داں ہیں۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۸ کو انھیں فزکس کا نوبیل انعام ملا۔ اس کے بعد وہ عالمی شہرت کے مالک ہوگیے۔ ان کی سائنسی دریافت رمن ایفکٹ (Raman Effect) آج سائنس کے مسلّمات میں شمار ہوتی ہے۔ رمن ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دس روپیہ ماہوار پر اسکول ٹیچر تھے۔ انھوں نے انتہائی مشکل حالات میں اپنی غیر معمولی محنت کے ذریعہ علم کی دنیا میں اپنا موجودہ مقام حاصل کیا۔ انھوں نے اپنی کامیابی کے سفر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ـــــ شکست، مایوسی، محنت اور ہر قسم کے دکھ کی ایک لمبی تاریخ :

A long history of frustration, disappointment, struggle and every kind of tribulation.

ایک شخص نے رمن کی علمی کامیابی کو گھٹانے کے لیے کہا کہ آپ اپنی دریافت تک محض اتفاق کے ذریعہ پہونچے ہیں، جیسا کہ اکثر دوسرے سائنس داں بھی محض اتفاق کے ذریعہ اپنی دریافتوں تک پہونچے۔ رمن نے اس کو سن کر سنجیدگی کے ساتھ کہا :

The idea that a scientific discovery can be made by accident is ruled out by the fact that the accident, if it is one, never occurs except to the right man.

یہ تصور کہ سائنسی دریافت اتفاق کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے، اس حقیقت کی بنا پر خارج از بحث ہے کہ اتفاق، اگر واقعۃً پیش آئے، تو وہ کبھی ایک صحیح آدمی کے سوا کسی اور کے ساتھ پیش نہیں آتا۔ ڈاکٹر رمن نے اپنی زندگی کی آخری دریافت کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

The right man, right thinking, right instruments, and right results.

صحیح آدمی، صحیح فکر، صحیح آلات، اور پھر صحیح نتیجہ۔ (ہندستان ٹائمس، ۱۷ جنوری ۱۹۸۷)

دوسروں کے ذمہ

اپریل ۱۹۸۶ کا واقعہ ہے۔ عرب دنیا کے ایک معروف ادیب (ڈاکٹر عبدالحلیم عویس) ہمارے مرکز میں آئے اور چند دن ہمارے ساتھ قیام کیا۔ ۱۰ اپریل کو وہ اپنا کوٹ ایک ہینگر پر لٹکا رہے تھے۔ اس وقت وہ مسکرائے اور ایک لطیفہ بیان کیا۔ انھوں نے ایک عرب شخصیت کا نام لیتے ہوئے کہا کہ ان کا قول ہے :

نحنُ نُعَلِّقُ علیٰ شمّاعة (علّاقة) الاستعمار كُلَّ أخطائنا

یعنی ہم اپنی تمام غلطیوں کو استعمار کے ہینگر پر لٹکا دیتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر یہ صحیح ترین تبصرہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر جو لکھنے اور بولنے والے پیدا ہوئے ان کو پڑھیے اور سنیے تو تقریباً بلا استثناء یہ ملے گا کہ ہر آدمی مسلمانوں کی بربادی کا مرثیہ پڑھ رہا ہے اور ہر آدمی مسلمانوں کی بربادی کا ذمہ دار دوسری قوموں کو قرار دے رہا ہے۔

یہ بات اتنی زیادہ عام ہے کہ جو لوگ بظاہر اس سے مختلف بات کہتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ بھی حقیقتہً اس سے مختلف نہیں ہیں۔ ایک شخص سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے ایک رہنما کا نام لیا جنھوں نے اپنی تقریر میں جوش وخروش کے ساتھ غیر اقوام کی سازشوں کا انکشاف کیا تھا اور کہا تھا کہ ان سازشوں نے مسلمانوں کو زبردست نقصان پہونچایا ہے۔ مذکورہ شخص نے فوراً کہا کہ نہیں۔ آپ اس رہنما کی فلاں تقریر کو پڑھیے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی بربادی کا ذمہ دار خود مسلمانوں کو قرار دیا ہے۔ میں نے یہ کہا کہ آپ کا یہ حوالہ صرف مذکورہ رہنما کی تضاد فکری کو بتاتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انھوں نے اصل حقیقت کو نہیں سمجھا ہے، اس لیے مجمع کی رعایت سے وہ کبھی ایک بات کہہ دیتے ہیں اور کبھی دوسری بات۔

اس دنیا میں آدمی صرف اپنے کیے کو بھگتتا ہے۔ اگر دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے تو بربادی کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ کیوں کہ اصل سبب تو خود اپنے اندر تھا، اور وہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔

ایک مشورہ

یوسف اسلام ایک انگریز نومسلم ہیں۔ ان کا پچھلا نام کیٹ اسٹونس (Cat Stevens) تھا۔ ۱۹۷۷ میں انھوں نے لندن کی ایک مسجد میں اسلام قبول کیا۔

لندن کے انگریزی ماہنامہ دی مسلم (مئی۔ جون ۱۹۸۰) میں یوسف اسلام صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ انٹرویو لینے والے شخص نے ان سے پوچھا کہ انگلینڈ کے اخبارات مسلسل اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں، اس کا حل کیا ہے۔ یوسف اسلام صاحب نے جواب دیا: لوگ اتنے نادان نہیں ہیں کہ ہر چیز جو اخبار میں چھپے اس پر یقین کرلیں۔ لوگ اپنی رائیں خود بناتے ہیں۔ تاہم اگر وہ مسلمانوں کو مذکورہ برائی میں ملوث دیکھیں گے تو عین ممکن ہے کہ وہ اخبار کی رپورٹ پر یقین کرلیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز صورت واقعہ ہے نہ کہ اخبار کی خبر۔ اگر مسلمانوں کی عمومی زندگی اس سے مختلف ہو جو اخبار میں کسی "دشمن اسلام" نے چھاپی ہے تو کوئی بھی پڑھنے والا اس کو کسی قسم کی اہمیت نہیں دے گا۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے اخبار میں یہ چھاپے کہ ہندستان میں جہالت کی شرح سب سے زیادہ عیسائیوں میں ہے۔ پارسیوں میں سب سے زیادہ فقیر ہوتے ہیں۔ سردار قوم سب سے زیادہ بزدل قوم ہے، تو اس قسم کی باتوں سے کوئی بھی اثر نہیں لے گا۔ کیوں کہ یہ باتیں معلوم واقعات کے سراسر خلاف ہیں۔

اسی طرح اگر لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی تصویر اچھی بن جائے تو ان کے بارہ میں لوگوں کے برے بیانات اپنے آپ بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔

اگر لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی عملی تصویر یہ ہو کہ وہ حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں متحد رہتے ہیں۔ وہ لین دین میں بے انصافی نہیں کرتے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل نہیں ہوتے۔ وہ انسان کی جان و مال اور عزت کا احترام کرتے ہیں۔ اگر آج لوگوں کے نزدیک مسلمان ہونے کا مطلب یہ بن جائے تو لوگ اخبارات کی مخالفانہ سرگرمیوں کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔ وہ اس قسم کی رپورٹوں اور خبروں کو اتنا غیر اہم سمجھیں گے کہ سرخی دیکھنے کے بعد شاید وہ اس کا مطالعہ بھی نہ کریں

ملّت کی کہانی

لارڈ لوتھین (۱۹۴۰ — ۱۸۸۲) برطانیہ کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنی وفات سے دو سال پہلے ۱۹۳۸ میں ہندستان آئے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ پڑھا۔ اس خطبہ میں انھوں نے مسلمان نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"یورپ اپنے سیاسی، معاشی، تمدنی اور عائلی مسائل کا تسلی بخش حل دریافت کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ آپ حضرات کا دعویٰ ہے کہ اسلام زندگی کا مکمل دستور العمل ہے۔ اور اس میں اجتماعی مسائل کا بہترین حل موجود ہے۔ اس لیے میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بلاد مغرب میں جاکر وہاں کے باشندوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔"

یورپ کے ایک ذمہ دار شخص نے ایک مسلم ادارہ میں یہ بات اب سے ۵۰ سال پہلے کہی تھی۔ مگر نصف صدی گزر گئی اور اس پوری مدت میں کوئی ایک بھی قابل ذکر مسلمان نہیں اٹھا جو خدا کا دین لے کر اہلِ یورپ کے درمیان دیوانہ وار داخل ہو جائے۔ موجودہ زمانہ میں مختلف اسباب کے تحت مسلم شخصیتوں کے یورپ کے سفر ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ تمام اسفار صرف یورپ میں قیام کرنے والے مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں نہ کہ حقیقۃً یورپ کے ان اصل باشندوں کے درمیان جن کے ایک فرد لارڈ لوتھین تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے "اسلامی کیرکٹر" کی حفاظت کے لیے ہمارے تمام چھوٹے بڑے لیڈر میدان جہاد میں سرگرم ہیں۔ مگر کسی لیڈر کو یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ کیا وجہ ہے کہ پچھلے ۵۰ سال کے اندر علی گڑھ نے کوئی ایک قابل ذکر فرد ایسا پیدا نہیں کیا جو انگریزی زبان اور نئے علوم سے واقفیت حاصل کر کے یورپ جائے اور وہاں کے غیر مسلم باشندوں کو اسلام کا پیغام پہونچائے "اسلامی کیرکٹر" کی حفاظت کا مطلب اگر صرف یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے داخلہ اور ملازمت کا حق محفوظ رہے تو یہ اسلام کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔ یہ اپنے قومی اغراض کے لیے اسلام کا نام استعمال کرنا ہے۔ اور جو لوگ اپنے قومی اغراض کے لیے اسلام کا نام استعمال کریں

وہ اللہ کے یہاں غضب کے مستحق ہوتے ہیں نہ کہ رحمت و نصرت کے مستحق۔

لارڈ لوتھین کی مذکورہ تجویز پر عمل کرنے کے لیے انگریزی دانی کی ضرورت تھی، اس لیے عام مسلم رہنماؤں کے لیے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک اور دعوتی موقع پیدا کیا تھا، اور اس موقع کو استعمال کرنے کے لیے اپنی مادری زبان ہی کافی تھی۔ مگر یہاں بھی ہمارے رہنما صد فی صد ناکام رہے۔

یہ امکان نوآبادیاتی نظام نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کی قومیں جدید طاقت کے زور پر ساری دنیا میں پھیل گئیں۔ اور جگہ جگہ انھوں نے اپنا اقتدار قائم کیا۔ اس قسم کے لوگ خود اپنی ضرورت اور مصلحت کے تحت ہر جگہ کی مقامی زبان بھی سیکھتے تھے۔ مثلاً جو انگریز اس زمانہ میں ہندستان آئے انھوں نے یہاں کی مقامی زبان بھی سیکھی اور یہ حیثیت اس زمانہ میں جس زبان کو حاصل تھی وہ اردو زبان تھی۔

جن ہندستانیوں کی عمریں پچاس سال سے اوپر ہیں وہ بخوبی طور پر اس واقعہ کو جانتے ہیں کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب سے پہلے ہندستان میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو تھی۔ تاہم جو لوگ بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں، ان کے سمجھنے کے لیے یہاں میں ایک حوالہ نقل کرتا ہوں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اردو زبان (Urdu Language) کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کی ملکی تقسیم سے پہلے اردو زبان شمالی ہند کی عمومی طور پر بولی جانے والی زبان تھی جو اس وقت ہندستانی یا کھڑی بولی کہی جاتی تھی:

The spoken language, referred to before the 1947 partition as Hindustani or Khari Boli, was the lingua franca of northern India (X/297).

ایک واقعہ

میجر جنرل اجیت انیل ردرا ۱۹۱۵ میں ہندستانی فوج میں داخل ہوئے۔ اب ان کی عمر ۹۰ سال ہو چکی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ اکتوبر ۱۹۸۶) کے ایک اسٹاف رپورٹر سے بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے پچھلے زمانہ کی اپنی بہت سی یادداشتیں بتائیں۔ انھوں نے

اس سلسلے میں جو واقعات بتائے ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا۔

۱۹۴۷ سے پہلے جب وہ فوج کی باقاعدہ سروس میں تھے تو فیض احمد فیض بھی ان کے تحت کام کرتے تھے۔ فیض کا تعلق فوج کے رابطۂ عامہ (Public relations) کے شعبہ سے تھا۔ ایک بار فیض کے ذمہ یہ کام سپرد ہوا کہ وہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کا ہندستانی زبان میں ترجمہ کریں۔ فیض نے ترجمہ کر کے بھیج دیا۔ اس کے بعد فیض احمد فیض اور میجر جنرل رودرا دونوں وائسریگل لاج (راشٹرپتی بھون) بلائے گیے تاکہ وہ ادائیگی الفاظ کے معاملہ میں وائسرائے کی رہنمائی کر سکیں۔ اس کے بعد میجر جنرل رودرا کے الفاظ یہ ہیں:

> When Faiz and myself called on the Viceroy to help him with the diction, Mountbatten was pacing up and down his room in the now christened Rashtrapati Bhawan rehearsing his speech. He was speaking Hindustani quite well, much to our surprise.

جب فیض احمد فیض اور میں وائسرائے کی ملاقات کے لیے گیے تاکہ الفاظ کی ادائیگی کے معاملہ میں ان کی مدد کریں، تو ماؤنٹ بیٹن اپنے موجودہ راشٹرپتی بھون کے کمرہ میں اِدھر سے اُدھر چل رہے تھے اور اپنی تقریر کو دہرا رہے تھے۔ اس وقت وہ بالکل صاف ہندستانی بول رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ہم کو سخت تعجب ہوا۔

یہ واقعہ ۱۹۴۷ سے پہلے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب کہ ملک میں ہندستانی (یا اردو) کا غلبہ تھا۔ ملک کے اعلیٰ ترین حکام بھی اردو اور ہندستانی کو بولتے اور سمجھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہندستان کی اردو بولنے والی قوم اور حکمرانوں کے درمیان زبان کا وہ فاصلہ (Language gap) موجود نہ تھا جو آج پایا جا رہا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت داعی کی جو زبان تھی وہی مدعو کی زبان بھی تھی۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ داعیوں کے گروہ نے اس امکان کو ایک فیصد بھی استعمال نہیں کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے لیڈروں نے اس زمانہ میں ان حکمرانوں سے بے شمار ملاقاتیں کیں۔ مگر یہ تمام لیڈران حکمرانوں سے صرف مانگنے کے لیے ملتے تھے نہ کہ انھیں دینے کے لیے۔ وہ یہی کرتے رہے یہاں تک کہ وہ دور ختم ہو گیا جس میں اردو زبان نے عوامی اہمیت حاصل کی تھی۔

دعوتی عمل

"اس جزیرہ میں تو صرف مگرمچھ اور سانپ اور کھنکھجورے ہیں" مسیحی سیاح نے اپنی سیاحت سے واپس آکر مسیحی مشنری کو رپورٹ دی۔

"خیر انھیں ہونے دو، یہ بتاؤ کہ کیا وہاں کچھ انسان بھی ہیں"

"ہاں، ہیں کیوں نہیں۔ مگر ایسے وحشی اور خونخوار ہیں کہ ان کے درمیان قدم رکھنے کا تو خیال بھی نہ کیجیے"

"بس معلوم ہوگیا۔ اتنی اطلاع کافی ہے۔ انسان جہاں کہیں بھی آباد ہیں، مشنری کا وہاں پہونچنا ضروری ہے"

یہ خلاصہ ہے اس گفتگو کا جو ایک مسیحی سیاح اور لندن مشنری سوسائٹی کے ایک ذمہ دار کے درمیان ۱۷۸۰ میں جزیرہ نیوگنی کے جنوبی ساحل پر ہوئی۔ اس کے بعد جزیرہ میں مشنری کا کام شروع ہوگیا۔ اور اب اس گفتگو کے سو برس بعد جزیرہ نہ صرف مہذب ہوچکا ہے بلکہ اس کی بیشتر آبادی عیسائی ہے۔ دو ہزار برس پہلے مسیح اس دنیا سے گیے تو ان کے پیچھے صرف ایک درجن عیسائی تھے۔ مگر مسلسل تبلیغ کے نتیجہ میں آج عیسائیوں کی تعداد تمام مذاہب میں سب سے زیادہ ہے۔ عیسائیوں کے تبلیغی ادارے اتنے منظم ہیں اور اتنے وسیع پیمانہ پر کام کر رہے ہیں جس کی کوئی دوسری مثال ساری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس کے برعکس مسلمانوں پر ان کے پیغمبر نے یہ ذمہ داری ڈالی تھی کہ وہ قیامت تک ساری قوموں تک اسلام کا پیغام پہونچاتے رہیں۔ مگر پیغمبر اسلام کے ابتدائی پیروؤں کے بعد یہ کام تقریباً بند ہوگیا۔ بلاشبہ اسلام بعد کی صدیوں میں بھی پھیلتا رہا ہے۔ مگر وہ زیادہ تر خود اپنے زور پر پھیلا ہے۔ ورنہ مسلمانوں کا محبوب ترین مشغلہ جس میں وہ موجودہ سائنٹفک دور میں بھی انتہائی انہماک کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، وہ جنگ و جدل اور سیاسی معرکہ آرائی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور چیز انھیں کام ہی نظر نہیں آتی جس میں وہ اپنے آپ کو مشغول کریں۔ اس عموم میں بعض استثنا ضرور ہے۔ مگر وہ استثنا اصاغر کا ہے نہ کہ اکابر کا۔

دعوتی عمل کی اہمیت صرف اس اعتبار سے نہیں ہے کہ وہ اسلام کی توسیع اور اشاعت کا ذریعہ ہے۔ اس کی اہمیت خود موجودہ مسلمانوں کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ ہے۔

گڑھے کے پانی میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے مگر دریا کے پانی میں کبھی بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ گڑھے کا پانی ٹھہرا ہوا ہوتا ہے۔ گڑھے کا پانی ہمیشہ وہی پانی رہتا ہے۔ اس میں نیا پانی داخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس دریا کا پانی جاری پانی ہے اس میں ہر وقت نیا پانی آتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گڑھے کے پانی میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور دریا کے پانی میں بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ ایسا ہی کچھ معاملہ قوموں کا بھی ہے۔ قومیں اسی وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان میں نیا خون داخل ہوتا رہے۔ جس قوم میں نیا خون داخل ہونا بند ہو جائے وہ بند گڑھے کی طرح بے جان ہو کر رہ جائے گی۔

اسلام کی تاریخ اس اصول کی تصدیق کرتی ہے۔ اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر بنو امیہ کے زمانہ تک اس کو زبردست عروج حاصل رہا۔ اس کے بعد بنو عباس کے دور کے نصف آخر میں زوال شروع ہو گیا۔ عروج کی تاریخ پستی کی تاریخ میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد اسلام کو دوبارہ عروج اس وقت ہوا جب کہ ترک اقوام بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہو گئیں۔ ترکوں کے ذریعہ اسلام کو دوبارہ عروج حاصل ہوا جو کئی سو سال تک جاری رہا۔ اسلام کے جسم میں نئے خون نے داخل ہو کر اسلام کو نئی زندگی دیدی۔

انیسویں صدی میں مغربی طاقتیں ابھریں۔ انھوں نے مغلوں اور ترکوں کو مغلوب کر کے تقریباً ساری دنیا میں اپنا غلبہ قائم کر لیا۔ اسلام کی تاریخ دوبارہ تنزل کا شکار ہو گئی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اسلام کے جسم کو دوبارہ نئے خون کا انتظار ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک کا زمانہ اسلامی تحریکوں کا زمانہ ہے۔ اس سو سالہ مدت میں بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھیں غیر معمولی پھیلاؤ حاصل ہوا۔ وہ مجموعی طور پر تقریباً تمام مسلمانوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر عظیم الشان ہنگاموں کے

باوجود ان کے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ اسلام کی تاریخ کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے میں کامیاب ہوسکیں۔

ان تحریکوں کی عظیم الشان کامیابیوں کے درمیان عظیم الشان ناکامی کا سبب صرف ایک تھا۔ وہ یہ کہ تمام کی تمام تحریکیں صرف مسلمانوں میں کام کرتی رہیں۔ ان میں کوئی بھی قابلِ ذکر تحریک نہیں ہے جس کی جدوجہد کا نشانہ غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہونچانا ہو۔ سب کے سب "پرانے خون" پر محنت کرتے رہے۔ "نئے خون" کے لیے ان میں سے کوئی متحرک نہ ہوسکا۔

یہی ان تحریکوں کی ناکامی کا اصل سبب ہے۔ اسلام کی تاریخ کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے کے لیے "نئے خون" کی ضرورت تھی۔ مگر موجودہ دور میں ہماری تمام تحریکیں صرف "پرانے خون" پر اپنی طاقت صرف کرتی رہیں۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ کی بے شمار کوششیں ضائع ہوکر رہ گئیں۔ اور اسلام کی تاریخ دوبارہ نہ بنائی جاسکی۔ بے جان افراد کے ذریعہ جاندار قوم کی تعمیر ممکن نہیں۔

بنو امیہ کے بعد اسلامی تاریخ پر جو زوال آیا اس کو دوبارہ عروج نئے خون کے ذریعہ ملا۔ اب موجودہ زمانہ میں اسلام کی تاریخ جس زوال سے دوچار ہے اس کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ اسلام کی صفوں میں نئے خون کو داخل کیا جائے۔ یہی پہلے بھی اس مسئلہ کا حل تھا اور یہی آج بھی اس مسئلہ کا حل ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں جس کے ذریعہ سے دورِ جدید میں دوبارہ اسلام کی نئی تاریخ بنائی جاسکے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم (محمد — آخر)

اور اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمہاری جگہ دوسروں کو لائے گا، پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔

دین ایک ابدی حقیقت ہے۔ البتہ دین کے حاملین بدلتے رہتے ہیں اور تبدیلی کا یہ عمل ہی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ حاملین دین کے اندر مطلوبہ کردار باقی رہے۔

اتحادِ ملّت

اتحاد کیا ہے۔ اتحاد نام ہے اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا۔ موجودہ دنیا میں کوئی گروہ اختلاف فکر سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے موجودہ دنیا میں کسی گروہ کے اندر اتحاد صرف اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانتا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اتحاد ہمیشہ صبر کی زمین پر قائم ہوتا ہے۔ اتحاد صرف کسی ایسی قوم کے اندر ظہور میں آتا ہے جس کے اندر برداشت کی طاقت ہو۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں صبر و برداشت کو کھو دیا ہے، اس لیے وہ اتحاد کو بھی کھوئے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کو بے برداشت بنانے کے اصل ذمہ دار مسلمانوں کے عین وہی رہنما ہیں جو مسلمانوں کو اتحاد کا پیغام دینے میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ ایک رہنما جب اپنے خلاف تنقید سن کر مشتعل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اس عمل سے لوگوں کو بے برداشت ہونے کا سبق دے رہا ہے۔ ایک رہنما جب کسی مسلم حکمراں کی "غلطی" کو دیکھ کر بپھر اٹھتا ہے اور اس کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع کر دیتا ہے تو عین اسی وقت وہ قوم کو بے برداشت بنا رہا ہوتا ہے۔ ایک رہنما جب غیر قوم کے جلوس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ قوم کو بے برداشت بنانے میں بھی اپنا حصہ ادا کر رہا ہوتا ہے۔ وغیرہ

ہمارے رہنما ہر روز اپنے عمل سے اسی قسم کے نمونے پیش کر رہے ہیں۔ وہ ہر اختلافی بات پر پرجوش ردعمل ظاہر کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ مسلسل قوم کو یہ سبق دے رہے ہیں کہ کسی خلاف مزاج بات کو برداشت نہ کرو، ہر چیز جو تمہیں پسند نہ آئے اس کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑے ہو جاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے رہنماؤں کا یہی مزاج ہے۔ ان کا یہ مزاج مسلمانوں کو بے صبری کی تربیت دے رہا ہے۔ اور بلاشبہ بے صبری ہی اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ——— ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور اتحاد کی بھی ایک قیمت ہے۔ یہ قیمت ہے خلافِ اتحاد باتوں کو برداشت کرنا۔

خاموشی ضروری ہے

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت)

حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ بولنا۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں بولنا انتہائی ضروری ہوتا ہے اس لیے اس شخص کو گونگا شیطان (شیطان اخرس) کہا گیا ہے جو بولنے کے موقع پر نہ بولے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کہ چپ رہنا ہی زیادہ صحیح اور ضروری ہے۔

خاموشی کے ضروری ہونے کی ایک مثال غزوۂ احد کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگئے تھے اور ایک غار میں لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے اعلان کر دیا کہ محمدؐ قتل کر دیئے گیے۔ صحابہ پر سراسیمگی چھا گئی۔ اس دوران ایک صحابی کی نظر آپ پر پڑی۔ وہ بول پڑے کہ رسول اللہ یہاں ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بولے بغیر اشارہ سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو (اشار الیہ الرسول ان اصمت) اس کی ایک مثال وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو، جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تم نے لغو فعل کیا (اذا قلت لصاحبك اسكت والامام يخطب فقد لغوت)

انفرادی مجالس میں بھی خاموشی کا یہ اصول ضروری ہے۔ مگر جب معاملہ قوم کا ہو تو اس کی اہمیت لاکھوں گنا بڑھ جاتی ہے۔ کسی نازک موقع پر ایک رہنما کی خاموشی ایک بڑے فساد کو روکنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک رہنما کی بے موقع تقریر ایک ایسا فساد برپا کر سکتی ہے جس میں سیکڑوں انسان مارے جائیں اور کروروں روپے کی جائداد جلا کر خاک کر دی جائے۔ اسی مفہوم میں سسٹر کنسولتا (Sister Consolata) نے کہا ہے کہ کسی قوم کی ناکامیوں کی سب سے زیادہ تعداد کا سبب خاموشی کے اصول کو توڑنا ہے:

The greatest number of failings in a community come from breaking the rule of silence.

دین میں غلو

اسلام میں جو چیزیں منع ہیں ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو غلو کہا گیا ہے۔ یعنی حد سے تجاوز کرنا۔ غلو کا یہ فعل ہمیشہ دینی معاملات میں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں نصاریٰ کو غلو سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ لا تغلوا فی دینکم (المائدہ ۷۷) یہ نہیں فرمایا کہ لا تغلوا فی کفرکم۔

میرے ہم وطنوں میں ایک صاحب تھے ان کا نام قمرالدین تھا۔ بہت مخلص آدمی تھے۔ نماز روزہ کے حد درجہ پابند تھے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا کہ جمعہ کی نماز کے لیے وقت پر مسجد پہونچنا ان کے لیے دشوار ہو جاتا۔ اس کی وجہ "شرعی غسل" کے بارے میں ان کا انتہا پسندانہ تصور تھا۔ جمعہ کے دن جب وہ نہانا شروع کرتے تو بار بار انھیں شبہہ ہو جاتا کہ ان کا غسل مکمل نہیں ہوا۔ فلاں جگہ کے بال تک پانی نہیں پہونچا۔ جسم کا فلاں حصہ دھونے سے رہ گیا۔ چنانچہ وہ گھنٹوں غسل خانہ میں نہاتے رہتے۔ بعض اوقات یہ مدت اتنی لمبی اور اتنی تکلیف دہ ہو جاتی کہ غسل کے عمل میں حوض کے پانی کے ساتھ ان کی آنکھوں کے آنسو بھی شریک ہو جاتے۔

یہ ایک غیر ضروری قسم کا شک تھا۔ شریعت کی نظر میں یہ غلو ہے نہ کہ اسلامی احتیاط۔ غلو کی یہ برائی ہمیشہ دینی جذبہ کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ مگر اپنے انجام کے اعتبار سے وہ دین کی ضد بن جاتی ہے۔ ابتدائی نیت کے اعتبار سے وہ بظاہر معصوم ہوتی ہے مگر عملی صورت اختیار کرنے کے بعد غیر معصوم۔

اللہ کی عبادت کرنا اسلام کے فرائض میں سے ہے۔ لیکن اگر کوئی عبادت گذار مغرب کے وضو سے فجر کی نماز پڑھے یا ہر رات کو سارا قرآن ختم کرنے لگے تو اس طرح کا فعل عبادت میں غلو بن جائے گا۔

اسلام میں غیرت مندی کو پسند کیا گیا ہے۔ لیکن کسی کی غیرت اگر اس حد تک بڑھے کہ اس کو اپنے خلاف سچائی کے اعتراف میں بھی غیرت آنے لگے تو ایسی غیرت غلو کی فہرست میں شامل ہو جائے گی۔ اسلام میں اہلِ علم کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔ لیکن اگر اہلِ علم کے احترام کا مطلب یہ لیا جائے کہ اہلِ علم پر تنقید نہ کرو تو یہ غلو بن جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ محض دینی جذبہ کسی عمل کو دینی نہیں بناتا۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمل خدا کے حکم اور رسول کے نمونہ کے مطابق ہو۔

فیض بقدر استعداد

حدیث میں ہے کہ تمہارے دین کی سب سے بہتر چیز تفقہ ہے (خیر دینکم الفقہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس کے لیے ان الفاظ میں دعا فرمائی: اللّٰھم فقّھہ فی الدّین وعلّمہ التاویل (خدایا، اس کو دین کی فہم عطا فرما اور اس کو تاویل کلام کی صلاحیت دے) بخاری و مسلم میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

عن ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال: اِنّ مثل مابعثنی اللہ بہ من الھدیٰ والعلم کمثل غیث اصاب ارضًا، فکانت منھا طائفۃ طیبۃ قبلت الماء فانبتت الکلأ والعشب الکثیر... وکان منھا اجادب امسکت الماء فنفع اللہ بھا الناس... فشربوا منھا وسقوا وزرعوا.... واصاب طائفۃ منھا اخریٰ، انّما ھی قیعان لا تمسک ماء ولا تنبت کلأ ... فذالک مثل من فقہ فی دین اللہ ونفعہ مابعثنی اللہ بہ فعلم وعلّم، ومثل من لم یرفع بذالک رأسا ولم یقبل ھدی اللہ الذی ارسلت بہ۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے جس ہدایت اور علم کے ساتھ مجھے بھیجا ہے اس کی مثال ایک بارش کی ہے جو زمین پر برسے۔ اس کا ایک حصہ زرخیز تھا۔ اس نے پانی کو قبول کیا اور خوب گھاس اور سبزہ اُگایا۔ اور اس زمین کا ایک حصہ بنجر زمین ہو۔ اس نے پانی کو روکا تو اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ پہونچایا۔ اور زمین کا ایک اور حصہ ڈھلوان تھا۔ وہ نہ پانی کو روکتا تھا اور نہ سبزہ اُگاتا تھا۔ پس یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی، اس سے اس کو نفع ہوا۔ اس نے سیکھا اور سکھایا۔ اور (دوسری) مثال اس شخص کی ہے جس کو اس میں سے کوئی حصہ نہ ملا اور اس نے اس ہدایت کو قبول نہ کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔

زمین کو بارش کا فائدہ اس کی استعداد کے بقدر ملتا ہے، یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ خدا کی ہدایت تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔ مگر جو شخص جتنی استعداد کا ثبوت دے گا اتنا ہی فائدہ اس کو حاصل ہوگا۔ اور سب سے بڑا فائدہ جو ہدایت الٰہی سے کسی کو ملتا ہے وہ معرفت ہے۔

ذہنی ارتکاز

چارلس ڈارون (۱۸۰۹ - ۱۸۸۲) موجودہ زمانہ کا مشہور ترین مفکر ہے۔ اس کے نظریہ سے اگرچہ راقم الحروف کو اتفاق نہیں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید انسان کی فکری تشکیل میں جتنا ڈارون کا حصہ ہے اتنا شاید کسی دوسرے مفکر کا نہیں۔

ڈارون نے موجودہ دنیا میں یہ غیر معمولی مقام اپنی غیر معمولی محنت کے ذریعہ حاصل کیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کے حالات بتاتے ہوئے لکھا ہے:

> All his mental energy was focussed on his subject, and that was why poetry, pictures, and music ceased in his mature life to afford him the pleasure that they had given him in his earlier days (5/495).

ڈارون کی تمام ذہنی طاقت اس کے موضوع پر وقف ہو گئی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ شاعری، تصویر اور موسیقی اس کی بعد کی زندگی میں اس کو وہ خوشی نہ دے سکیں جو کہ اس کی ابتدائی زندگی میں انھوں نے اس کو دیا تھا۔

یہ ذہنی ارتکاز کسی کام میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے، خواہ وہ صحیح کام ہو یا غلط کام۔ آدمی جب تک اپنے مقصد میں اتنا زیادہ گم نہ ہو جائے کہ بقیہ تمام چیزیں اسے بھول جائیں۔ کسی اور چیز میں اس کے لیے لذت باقی نہ رہے، اس وقت تک وہ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ تمام بڑے لوگوں نے اسی طرح کام کیا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی بڑا کام کرنے کا طریقہ نہیں۔

جب ایک آدمی کسی کام میں ہمہ تن مشغول ہوتا ہے تو اس وقت اس پر اس کام کے تمام چھپے ہوئے راز کھلتے ہیں۔ اسی وقت وہ اس کام کے تمام ضروری پہلوؤں پر توجہ دینے کے قابل بنتا ہے۔ اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ اس کی تمام فطری صلاحیتیں اس کے مقصد کے حصول میں لگ جائیں۔ یکسوئی اور لگن کے بغیر کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اکثر لوگ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا کام نہیں کرتے۔ اسی لیے اکثر لوگ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر پاتے۔

یک طرفہ اقدام کی ضرورت

صلح حدیبیہ (۶ھ) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے۔ اس موقع پر مخالفین اسلام نے صلح کی جو شرطیں پیش کیں، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بحث کے بغیر منظور کر لیا۔ یہ شرطیں سب کی سب مخالفینِ اسلام کے حق میں تھیں۔ چنانچہ جو مسلمان آپ کے ساتھ تھے ان کی اکثریت پر یہ صلح بے حد شاق گزری۔ حتی کہ بعض صحابہ یہ کہہ پڑے کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ اور کیا فریق ثانی باطل پر نہیں ہے۔ اگر ہم حق پر ہیں اور فریق ثانی باطل پر ہے تو ہم اس قسم کی ذلت آمیز شرائط پر صلح کیوں کریں۔

پیغمبر اسلامؐ اور عام مسلمانوں کے درمیان رائے کا یہ فرق کیوں ہوا۔ اس کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ مسئلہ کو یک طرفہ طور پر دیکھ رہے تھے اور عام مسلمان دو طرفہ طور پر۔ عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ کچھ ہم جھکیں اور کچھ وہ جھکیں۔ کچھ شرطیں ہماری مانی جائیں، کچھ شرطیں ان کی مانی جائیں۔ یعنی معاملہ کو دو طرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ جب کہ پیغمبر اسلامؐ کا خیال تھا کہ ہم اس بحث کو نہ چھیڑیں کہ اس معاملہ میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ اس بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم یک طرفہ طور پر فریق ثانی کی پیش کی ہوئی شرطوں پر راضی ہو جائیں۔

مسلمانوں کی رائے خالص منطقی اعتبار سے بالکل درست تھی۔ نظری انصاف کے اعتبار سے یقیناً یہی ہونا چاہیے تھا کہ دونوں میں سے کوئی فریق ضد نہ کرے، بلکہ اصولی بنیاد پر جو بات صحیح ہے اس پر دونوں فریق راضی ہو جائیں۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم معاملہ کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ اگر اصول اور منطق کی بنیاد پر اصرار کیا گیا تو فریق ثانی ہرگز راضی ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے عملی اعتبار سے مسئلہ کا ممکن حل صرف یہ ہے کہ فریقِ ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا جائے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں فریقوں میں ٹکراؤ کی صورت حال ختم ہو جائے گی۔ اور مسلمانوں کے کے لیے کام کے مواقع نکل آئیں گے۔ دو طرفہ بنیاد پر اصرار عملاً دونوں فریقوں کے درمیان ٹکراؤ کو برقرار رکھنے کے ہم معنی تھا۔ جب کہ یک طرفہ بنیاد پر راضی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جنگی ٹکراؤ ختم

ہو، اور میدانِ جنگ سے باہر جو ممکن دائرہ ہے، اس میں مسلمانوں کے لیے دعوت اور تعمیر کی جدوجہد کی راہیں کھل جائیں۔

دورِ نبوت کا یہ واقعہ موجودہ حالات میں ہمارے لیے رہنما واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان آج جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں وہ انتہائی پیچیدہ ہیں۔ پچھلے پچاس سال کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مسئلہ کا منطقی تجزیہ کرنا یا فریقِ ثانی کے سامنے اصولی مطالبات کا میمورنڈم پیش کرنا موجودہ حالات میں اتنا زیادہ بے فائدہ ہے کہ اس کی قیمت کاغذ کے اس ٹکڑے کے بقدر بھی نہیں ہے جس پر یہ منطقی اور اصولی مطالبات لکھے جاتے ہیں۔ اصولی مطالبہ صرف اس وقت بامعنی ہوتا ہے جب کہ فریقِ ثانی اصول کے آگے جھکنے کے لیے تیار ہو۔ اور موجودہ صورت حال میں اس کا کوئی ادنیٰ امکان بھی نہیں۔

مسلمان اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو دو طرفہ بنیاد پر طے کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ مسئلہ کا واحد قابلِ عمل حل صرف یہ ہے کہ اس کو یک طرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ اس وقت مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں نے فرصتِ عمل کو کھو دیا ہے۔ ان کے لیے ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے لیے کوئی تعمیری منصوبہ بنائیں اور اس کی طرف اپنا سفر شروع کریں۔ اگر مسلمان اس قربانی پر راضی ہو جائیں کہ وہ فریقِ ثانی سے اپنے تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں تو اس کا نقد فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان فوراً ہی اپنے لیے عمل کا موقع پالیں گے۔ جس کو وہ تقریباً نصف صدی سے کھوئے ہوئے ہیں۔ عمل کا موقع پانا گویا سفر کے آغاز کو پانا ہے۔ اور جو لوگ اپنے سفر کے آغاز کو پالیں وہ یقیناً ایک روز اپنے سفر کے اختتام کو پہونچ کر رہتے ہیں۔

یہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں جو نقصان کو برداشت کرے وہی فائدہ کو حاصل کرتا ہے۔ یک طرفہ طور پر مسئلہ کو ختم کرنا اسی اصول کی تعمیل ہے۔ یک طرفہ طور پر مسئلہ کو ختم کرنے پر راضی ہونا بلاشبہ اپنے اندر نقصانات کے پہلو رکھتا ہے مگر موجودہ دنیا میں کسی بھی قسم کی ترقی کا یہی واحد زینہ ہے۔ موجودہ دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ صرف فائدہ چاہیں ان کے حصہ میں آخر کار صرف نقصان آئے، اور جو لوگ ابتدائی نقصان کو برداشت کریں وہ بالآخر ہر قسم کے فائدوں کے مالک بنیں۔

کم سمجھنا

زندگی نام ہے ناخوش گواریوں کو خوش گواری کے ساتھ قبول کرنے کا۔ تھیوڈور روز ویلیٹ (Theodore Roosevelt) نے اسی بات کو ان الفاظ میں کہا کہ زندگی کا سامنا کرنے کا سب سے زیادہ ناقص طریقہ یہ ہے کہ حقارت کے ساتھ اس کا سامنا کیا جائے:

The poorest way to face life is to face it with a sneer.

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بہت سے لوگ بھی یہاں زندگی کا موقع پائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے منصوبہ کے تحت ہر ایک کو اس کا سامانِ حیات دے رہا ہے۔ کسی کو ایک چیز، کسی کو دوسری چیز اور کسی کو تیسری چیز۔ ایسی حالت میں آدمی اگر دوسروں کو حقیر یا کم سمجھ لے تو وہ حقیقت پسندانہ نظر سے محروم ہو جائے گا۔ وہ نہ اپنے بارہ میں صحیح رائے قائم کر سکے گا اور نہ دوسروں کے بارے میں۔

تاریخ انسانی میں جو سب سے بڑا جرم کیا گیا ہے وہ عدم اعتراف ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں خدا کے نیک بندے حق کا پیغام لے کر اٹھے، انھوں نے لوگوں کو سچائی کی طرف بلایا۔ مگر ہمیشہ ایسا ہوا کہ ان کے مخاطبین کی اکثریت نے ان کو نظر انداز کر دیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے ان سچے انسانوں کو حقیر سمجھ لیا، صرف اس لیے کہ ان کے آس پاس انھیں دنیا کی رونقیں نظر نہ آئیں، وہ ان کو تختِ عظمت پر بیٹھے ہوئے دکھائی نہیں دیئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایک چھوٹے آدمی کے سامنے کیوں اپنے آپ کو جھکائیں۔

یہی معاملہ قومی رویہ کا بھی ہے۔ اگر ہم ایک قوم کو حقیر سمجھ لیں تو اس کے بارے میں ہمارا پورا رویہ غلط ہو کر رہ جائے گا۔ ہم اس قوم کی اچھائیوں کو بھی برائی کے روپ میں دیکھنے لگیں گے، ہم اس قوم کی طاقت کا غلط اندازہ کریں گے اور اس سے ایسے مواقع پر غیر ضروری طور پر لڑ جائیں گے جہاں بہترین عقل مندی یہ تھی کہ اس سے اعراض کیا جائے۔

دوسروں کو کم سمجھنا باعتبار نتیجہ خود اپنے آپ کو کم سمجھنا ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھنے کا آخری انجام صرف یہ ہے کہ آدمی خود دوسروں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جائے۔

بامعنی کائنات

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہماری قریبی کہکشاں ایک لاکھ سال نور کی وسعت میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کہکشاں کے اندر تین لاکھ ملین ستارے پائے جاتے ہیں۔ ہمارا شمسی نظام اس کے مرکز سے ۲۷ ہزار سال نور کے فاصلہ پر واقع ہے۔ کہکشاں کے اکثر ستارے ممکن طور پر کسی نہ کسی قسم کا سیاروں کا سلسلہ رکھتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر سیارے زندگی کے لیے غیر موزوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ستارہ سے یا تو بہت زیادہ قریب ہیں یا بہت زیادہ دور ہیں۔ تاہم چوں کہ ستاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، خالص حسابی اعتبار سے یہ امکان ہے کہ بہت سے سورج جیسے ستارے ہوں اور اسی طرح بہت سے زمین جیسے سیارے:

It is estimated that our Milky Way galaxy, which is 100,000 light years across, is composed of over 300,000 million stars. Our solar system is situated 27,000 light years away from the centre. Most of the stars are likely to have planets of some sort. But most of these planets will be unsuitable for life, because they are either too near or too far from their parent star. Yet because the number of stars is so great, there must, by sheer statistical probability, be many sun-like stars and earth-like planets.
The Hindustan Times, July 31, 1986, p. 9

تاہم بے شمار سیاراتی نظاموں میں صرف ایک ہی سیاراتی نظام ہے جس میں انسان جیسی زندہ مخلوق آباد ہو سکتی ہے۔ اور وہ وہی نظام ہے جس میں ہماری زمین واقع ہے۔ اس قسم کا کوئی اور سیاراتی نظام ابھی تک ساری کائنات میں معلوم نہ کیا جا سکا۔ موجودہ زمانہ میں سائنس کا ایک مستقل شعبہ وجود میں آیا ہے جس کو ایس ای ٹی آئی (SETI) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے ـــــ بالائے خلا ذہانت کی تلاش:

Search for Extra-Terrestrial Intelligence

زندگی کے ارتقائی نظریہ کے تحت سائنس دانوں کا گمان ہے کہ کائنات کے دوسرے مقامات پر بھی انسان جیسی ذہین مخلوق ہونی چاہیے۔ کیوں کہ ارتقائی عمل عموم چاہتا ہے، ارتقائی عمل میں استثناء کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس فرضی قیاس پر جدید انسان کو اتنا زیادہ یقین ہے کہ ایک سائنسی مصنف اسحاق ایسمو

(Issac Assimov) نے حساب لگا کر اعلان کیا ہے کہ ہماری کہکشاں میں چار سو ملین سیارے ایسے ہیں جن میں پودے اور حیوانات پائے جاتے ہیں یا پائے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ سب کا سب محض حسابی قیاس ہے، کھربوں ڈالر خرچ کرکے روس اور امریکہ نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کی ہیں ان کے ذریعہ اب تک زمین جیسے کسی ایک سیارے کا بھی کوئی ادنیٰ نشان دریافت نہ کیا جا سکا۔

سورج ایک اوسط درجہ کا ستارہ ہے۔ اس کا قطر آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے وہ ہماری زمین سے تقریباً بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ سورج کی سطح پر جو حرارت ہے اس کا اندازہ بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ ٹمپریچر کیا گیا ہے۔

زمین سے سورج کا فاصلہ تقریباً نو کرور ۳۰ لاکھ میل ہے۔ یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اگر یہ فاصلہ گھٹ یا بڑھ جائے تو زمین پر انسان جیسی مخلوق کی آبادکاری ناممکن ہو جائے۔ مثلاً اگر ایسا ہو کہ سورج نصف کے بقدر ہم سے قریب ہو جائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس کی شدت سے کاغذ جلنے لگے۔ اور اگر زمین اور سورج کا موجودہ فاصلہ دگنا زیادہ ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زمین پر زندگی جیسی چیز باقی نہ رہے۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہوگی جب کہ موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آ جائے۔ مثلاً ایک ستارہ ہے جس کی گرمی ہمارے سورج سے اسی ہزار گنا زیادہ ہے، اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو پوری زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

نئی مطبوعات

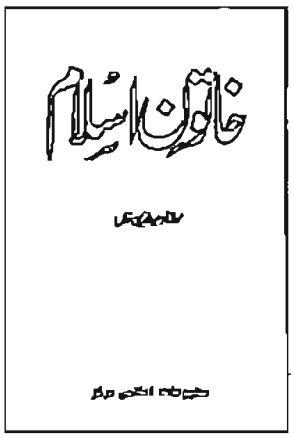

صفحات ۱۹۲ ۲۰ روپیہ

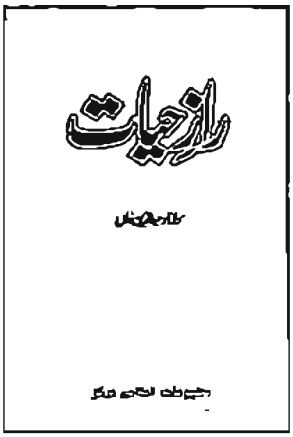

صفحات ۲۸۰ ۴۸ روپیہ

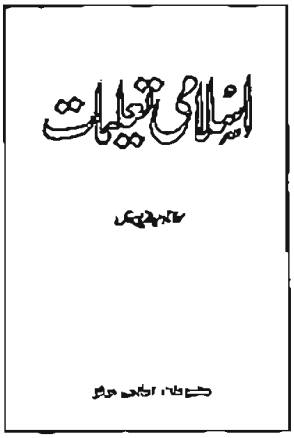

صفحات ۱۴۴ ۲۵ روپیہ

یہودی کردار

روایات میں آتا ہے کہ مدینہ میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ مال آیا۔ آپ نے اس کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ اس تقسیم میں کسی کو زیادہ ملا اور کسی کو کم۔ چنانچہ اس بنا پر کچھ لوگوں نے آپ کی دیانت داری پر شبہ ظاہر کرنا شروع کیا۔ ایک صحابی کہتے ہیں :

مررت برجلین واحد هما یقول لصاحبه واللّٰه ما اراد محمد بقسمته وجه اللّٰه ولا الدار الآخرة

میں دو آدمیوں کے پاس سے گزرا۔ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم محمدؐ نے اپنی اس تقسیم میں اللہ کی رضا اور آخرت کا گھر نہیں چاہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا: موسیٰ پر اللہ کی رحمت ہو، ان کو اس سے بھی زیادہ ستایا گیا مگر انھوں نے صبر کیا (رحمة اللّٰه علی موسیٰ لقد اوذی باکثر من هذا فصبر، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۵۲۱) قرآن کی حسب ذیل آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

یاایها الذین آمنوا لا تکونوا کالذین آذوا موسیٰ فبرأه اللّٰه مما قالوا وکان عند اللّٰه وجیها

(الاحزاب ۶۹)

اے ایمان والو، تم ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰ کو ستایا پھر اللہ نے ان کی کہی ہوئی باتوں سے موسیٰ کی برارت کردی اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا۔

یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس طرح ستایا اس کی تفصیل بائبل کی کتاب خروج اور کتاب گنتی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہودی انسائیکلوپیڈیا میں کہا گیا ہے کہ موسیٰؑ کو اپنی قوم کے باغی اور منحرف لوگوں سے بہت سی ذلت اور توہین برداشت کرنی پڑی، حتی کہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی جو کہ ان کی قیادت پر حسد کرتا تھا :

(Moses had) to suffer many indignities and insults from a rebellious and recalcitrant people, even from his closest relatives, who were jealous of his leadership.

Jewish Encyclopedia, Volume V, p. 442

یہ فرق کیوں

قرآن میں اہلِ جنّت کو دو بڑے طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک مقربین خاص۔ اور دوسرے عام انعام یافتہ لوگ۔ پھر بتایا گیا ہے کہ مقربین خاص کی تعداد پہلے لوگوں میں زیادہ ہوگی اور بعد کے لوگوں میں کم ہوگی۔

وکنتم ازواجًا ثلاثة۔ فاصحاب المیمنة ما اصحابُ المیمنة واصحاب المشئمة ما اصحاب المشئمة۔ والسابقون السابقون۔ اولئك المقربون۔ فی جنات نعیم۔ ثلة من الاولین۔ وقلیل من الاٰخرین۔ (الواقعہ)

اور تم لوگ (قیامت میں) تین قسم کے ہوجاؤ گے۔ پھر دائیں والے، کیا خوب ہیں دائیں والے۔ اور بائیں والے، کیسے برے ہیں بائیں والے۔ اور آگے والے تو آگے ہی والے ہیں۔ وہ مقرب لوگ ہیں۔ نعمت کے باغوں میں۔ ان کی بڑی تعداد اگلوں میں سے ہوگی، اور تھوڑی تعداد پچھلوں میں سے ہوگی۔

اس قرآنی بیان کی تشریح کرتے ہوئے ابن کثیر اپنی تفسیر کی کتاب میں لکھتے ہیں:

لاشك ان اوّل کلّ امة خیر من اٰخرها فیحتمل ان تعم الاٰیة جمیع الامم کلّ امة بحسبها۔ ولهٰذا ثبت فی الصحاح وغیرها من غیر وجه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم

(الجزء الرابع، صفحہ ۲۸۴)

اس میں شک نہیں کہ ہر امت کا پہلا گروہ اس کے بعد کے گروہ سے بہتر ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ آیت حسب حیثیت تمام امتوں کے لیے ہو۔ اور صحاح اور دوسری کتب حدیث میں ایک سے زیادہ طریقوں سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اس کے بعد جو لوگ آئیں گے اور اس کے بعد جو لوگ آئیں گے۔

پہلے گروہ اور دوسرے گروہ میں اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ایک مفسر قرآن لکھتے ہیں: "ہر امت کے پہلے طبقہ میں نبی کی صحبت یا قرب عہد کی برکت سے

اعلیٰ درجہ کے مقربین جس قدر کثرت سے ہوئے ہیں، پچھلے طبقوں میں وہ بات نہیں رہی۔" مگر یہ توجیہہ صحیح نہیں۔ اگر یہ فرق صحبت کی وجہ سے پیدا ہوتا تو قرآن میں یہ درج ہونا چاہیے تھا کہ دورِ اوّل کے تمام لوگ "السّابقون" ہوں گے اور دورِ ثانی کے تمام لوگ "اصحاب الیمین"۔

اس کے برعکس قرآن کے مطابق "صحبت یافتہ" طبقہ میں بھی دونوں قسم کے افراد ہوں گے اور "غیر صحبت یافتہ" طبقہ میں بھی دونوں قسم کے افراد۔

اصل یہ ہے کہ یہ فرق اصلاً نوعیت ایمان کے اعتبار سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ صرف نوعیتِ زمانہ کے اعتبار سے۔ پیغمبر کا دور دعوت کا دور ہوتا ہے۔ اس وقت جو لوگ اسلام میں داخل ہوتے ہیں وہ دعوت کے ذریعہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ شعوری انقلاب کے ذریعہ اسلام قبول کرتے ہیں۔ ان کا اسلام ان کے لیے ایک دریافت ہوتا ہے۔ یہ چیز ان کو وہ برتر ایمان عطا کرتی ہے جو ان کو السّابقون کی صف میں داخل کر دیتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں بعد والوں کا اسلام نسلی اسلام ہوتا ہے۔ ان کو اسلام بطور وراثت ملتا ہے نہ کہ بطور دریافت۔ ظاہر ہے کہ وراثت والے اسلام میں وہ خصوصیات نہیں ہو سکتیں جو دریافت والے اسلام میں ہوتی ہیں۔ تاہم بعد کے دور میں بھی جن افراد کو اللہ کی توفیق سے دریافت والا اسلام حاصل ہو جائے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک اس کے مستحق قرار پائیں گے کہ انھیں السّابقون کی صف میں داخل کیا جائے۔

ایک سفر

فروری ۱۹۸۷ میں حیدر آباد کا سفر ہوا۔ یہ حیدر آباد کے لیے میرا دسواں سفر تھا۔ ابتدائی چھ سفروں کا تذکرہ الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۳ میں شائع ہو چکا ہے۔ میرا ساتواں سفر اسلامی مرکز کی شاخ حیدر آباد کے افتتاح کے سلسلہ میں تھا۔ اس موقع پر وہاں افتتاحی جلسہ ہوا جس میں دیگر شخصیتوں کے علاوہ جناب سید مکثر شاہ صاحب اور جناب سید ہاشم علی صاحب شریک ہوئے۔ اس سفر کی روداد مقامی اخبارات (مثلاً سیاست، رہنمائے دکن، منصف ۱۲ فروری ۱۹۸۴) میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی۔

حیدر آباد کے لیے میرا آٹھواں سفر جولائی ۱۹۸۵ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ نومبر ۱۹۸۵ میں شائع ہو چکی ہے۔ نواں سفر جنوری ۱۹۸۶ میں ہوا۔ یہ ایک تنظیمی اور انتظامی نوعیت کا سفر تھا۔ اس موقع پر کوئی عمومی پروگرام نہیں کیا جا سکا۔ دسواں سفر موجودہ سفر تھا جو فروری ۱۹۸۷ میں پیش آیا۔

۱۳ فروری ۱۹۸۷ کی صبح کو ۶ بجے دہلی ایر پورٹ پر پہونچا تو حسب معمول ایر پورٹ پر آدمیوں کی زبردست چہل پہل تھی۔ کوئی ایک طرف جا رہا تھا اور کوئی دوسری طرف۔ کسی کے چہرہ پر سکون تھا اور کسی کے چہرہ پر اداسی۔ میں نے سوچا کہ کوئی شخص خوشی کی خبر سن کر جا رہا ہے اور کوئی شخص غم کی خبر سن کر۔ کوئی اپنے تجارتی فائدہ کی طرف جا رہا ہے اور کوئی اپنے تجارتی نقصان کی طرف۔ بظاہر ہر آدمی الگ الگ منزل کا مسافر ہے۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو سب کی منزل ایک ہے۔ اور وہ موت ہے۔ ہر ایک بالآخر موت کے کنارے پہونچنے والا ہے۔ مگر یہی وہ یقینی منزل ہے جس کا علم کسی کو نہیں۔

جہاز کے اندر "انفلائٹ ریڈنگ" کے لیے انڈین ایر لائنز کا ماہنامہ سواگت (فروری ۱۹۸۷) تھا۔ اس میں ایک مضمون ہندستان کے عیسائی چرچ کے بارہ میں تھا۔ اس مضمون کے ساتھ کئی تصویریں تھیں جن میں چرچ کی اندرونی تصویر بھی تھی۔ اس میں حضرت مسیح کو (نعوذ باللہ) اس حال میں دکھایا گیا تھا کہ جسم کے کپڑے اترے ہوئے ہیں اور ہاتھ پاؤں میں

میخیں ٹھونک کر آپ کو بالکل بے چارگی کے عالم میں ہلاک کیا جارہا ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے یورپ کے ایک عیسائی کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ مغربی دنیا میں عیسائیت کے زوال کا اصل سبب عیسائی مذہب نہیں بلکہ عیسائی چرچ ہیں۔ عیسائی چرچ ایک طرف حضرت مسیح کو خدا بتاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ دکھاتے ہیں کہ آپ کو بے چارگی کے ساتھ صلیب پر لٹکا کر ہلاک کر دیا گیا۔ اب آج کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان جب وسیع کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کو یہ تصور بالکل ناقابلِ فہم معلوم ہونے لگتا ہے کہ جو خدا اتنی بڑی کائنات کا خالق و مالک ہے، وہ اس بے چارگی کے ساتھ انسانوں کے ہاتھ سے ہلاک کر دیا جائے۔

آج حیدر آباد ایک شہر کا نام ہے۔ چالیس سال پہلے حیدر آباد ایک اسٹیٹ کا نام تھا جس کا رقبہ اٹلی کے برابر تھا۔ یہاں کا نواب دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔

حیدر آباد کا ابتدائی بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا۔ وہ بہمنی سلطنت میں ایک فوجی افسر تھا۔ ۱۵۱۲ء میں اس نے بغاوت کر کے اس علاقہ میں اپنی آزاد سلطنت قائم کر لی۔ جو تاریخ میں قطب شاہی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سلطنت چلتی رہی، یہاں تک کہ اورنگ زیب نے ۱۶۸۵ میں اس کو فتح کر کے مغل سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد یہاں مغل گورنر رہنے لگے۔ نظام الملک آصف جاہ اسی قسم کا ایک گورنر تھا۔ ۱۷۱۳ میں اس کا تقرر ہوا۔ اس کے بعد اس کے اندر آزادی کے رجحانات پیدا ہوئے۔ ۱۷۲۴ میں اس نے اس علاقہ کو دہلی کی مغل سلطنت سے کاٹ لیا اور یہاں اپنی آزاد سلطنت قائم کر لی۔ غیر منقسم ہندستان میں یہ ملک کی سب سے بڑی ریاست تھی۔

ہندستان کی آزادی کے بعد سابق مسلم نواب (نظام دکن) ریاست کو سابقہ حیثیت پر باقی رکھنا چاہتے تھے۔ وہ نئی ہندستانی حکومت سے موجودہ صورت حال کی بحالی کا معاہدہ (Standstill agreement) کرنے میں کامیاب ہو گیے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ کو اس معاہدہ پر دستخط ہو گیے تھے۔ اس معاہدہ کے تحت حیدر آباد کو ایک قسم کی نیم آزاد ریاست کی حیثیت حاصل رہتی۔ مگر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں، نظام حیدر آباد کا منصوبہ ناکام ہو گیا جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مقامی طور پر ایک مقبول مسلم لیڈر (قاسم رضوی) نے ایک عسکری

تحریک رضاکار کے نام سے چلادی۔ اس نے ہندستان کی فوجی طاقت کو موقع دیدیا کہ وہ ریاست میں مداخلت کرکے ستمبر ۱۹۴۸ میں اس کو اپنے کنٹرول میں لے لے۔ (چار روزہ پولس ایکشن کے بعد) حیدرآباد نے دوسری دیسی ریاستوں کی حیثیت کو قبول کرلیا۔ بعد کو وہ تقسیم کردی گئی اور جغرافی نقشہ سے اس کا وجود مٹ گیا:

> His plan miscarried, largely because a local populist Muslim leader launched a militant movement (the Razakars) that provided a motive for Indian military forces to intervene and restore order, in September 1948. Hyderabad accepted the same conditions as other former princely states and was later partitioned and disappeared from the map (9/423).

حیدرآباد کی مسلم ریاست ۱۷۲۴ میں اپنے مرکز سے بغاوت کے نتیجہ میں قائم ہوئی تھی۔ اور ۱۹۴۸ میں وہ خود مسلم قیادت کی نادانی کے نتیجہ میں ختم ہوگئی۔ یہی کہانی پچھلے کئی سو سال سے مسلم تاریخ میں دہرائی جارہی ہے۔ اپنے مرکز سے بغاوت کرکے اتحاد کو ختم کرنا اور پھر مزید نادانیوں کے نتیجہ میں اپنا وجود مٹالینا ـــــ حیدرآباد کا آغاز مسلم تاریخ کے ایک المیہ کو بتاتا ہے اور اس کا اختتام مسلم تاریخ کے دوسرے المیہ کو۔

پاکستان کی شائع شدہ ایک کتاب میں حیدرآباد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے ـــــ قائداعظم کی وفات (۱۱ ستمبر ۱۹۴۸) کی خبر سن کر تمام پاکستانی سوگ میں مصروف تھے۔ وہ شخصیت اس دنیا سے اُٹھ گئی تھی جس سے بھارتی لیڈر خائف تھے۔ اس لیے انھوں نے حیدرآباد کے خلاف فوجی کارروائی کرکے اسے زبردستی بھارت میں شامل کرلیا (تاریخ پاکستان وہند، صفحہ ۴۷۶)

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے ایسے فانی لیڈر تو پیدا کرلیے جن سے دیگر اقوام خائف ہوں۔ مگر وہ ایسے غیر فانی خدا کو نہ پاسکے جو دیگر اقوام کے مقابلہ میں ان کا مددگار بن سکے۔ کیسی عجیب ہے ان کی محرومی اور کیسی عجیب ہے ان کی کامیابی۔

شہر حیدرآباد کی ۳۰ لاکھ آبادی میں ۱۴ لاکھ مسلمان ہیں۔ یعنی کل آبادی کا تقریباً ۴۵ فی صد۔ تاہم مسلمانوں کی اس آبادی کا ۸۰ فی صد سے زیادہ حصہ قدیم حیدرآباد میں بسا ہوا ہے۔ جدید حیدرآباد میں ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے۔ مسلمانوں کی آبادی کا یہی تناسب ہندستان

کے اکثر شہروں میں نظر آتا ہے۔ ہر شہر میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ قدیم شہر میں زیادہ ہیں اور جدید شہر میں کم۔ یہ گویا ایک علامت ہے کہ مسلمان قدیم دور میں دنیا سے آگے تھے، مگر جدید دور میں وہ دنیا سے پیچھے ہو گیے۔

موجودہ حیدر آباد کے تین بڑے حصے ہیں۔ نیا حیدر آباد، پرانا حیدر آباد، سکندر آباد۔ یہاں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں وہ سب پرانے حیدر آباد میں ہوتے ہیں۔ نئے حیدر آباد یا سکندر آباد میں کوئی فساد نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نئے حیدر آباد اور سکندر آباد میں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں۔ مگر پرانے حیدر آباد میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ "تعلیم" فرقہ وارانہ فساد کے خلاف ایک روک کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو لوگ فی الواقع اس ملک میں فرقہ وارانہ فساد کو ختم کرنا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کریں۔ جب معاشرہ کے زیادہ لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو فساد کا سلسلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

پرانے حیدر آباد کا شاید سب سے بڑا مسئلہ ٹریفک کا ہجوم ہے۔ تنگ سڑکیں اور زیادہ ٹریفک، اسی کا دوسرا نام پرانا حیدر آباد ہے۔ بعض اوقات آدمی محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ پیدل چلے تو شاید وہ سواری سے پہلے اپنی منزل پر پہونچ جائے گا۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے یہاں کا لطیفہ بیان کیا۔ ایک شخص پرانے حیدر آباد کے علاقہ سے پیدل گزر رہا تھا، اتنے میں اس کا کوئی جاننے والا اپنی کار پر اُدھر سے گزرا۔ اس نے اپنی کار روک کر اس آدمی سے کہا کہ گاڑی میں آجائیے، آگے میں آپ کو آپ کی منزل پر چھوڑ دوں گا۔ آدمی نے یہ سن کر جواب دیا: آپ کا شکریہ، مگر مجھے ذرا جلدی ہے۔

حیدر آباد میں بہت سی تاریخی چیزیں ہیں جن کو دیکھنے کے لیے لوگ کثیر تعداد میں وہاں جاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک سالار جنگ میوزیم ہے۔ اس میوزیم میں ۴۰ ہزار سے زیادہ نادر نمونے رکھے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مشرقی دنیا میں یہ اپنی قسم کا واحد میوزیم ہے۔ اس کو ریاست کے ایک سابق وزیر اعظم نے بنایا تھا۔

اس میوزیم میں جو چیزیں رکھی گئی ہیں ان میں سے ایک عجیب چیز ایک سنگ مرمر کا مجسمہ ہے۔ اس مجسمہ میں ایک عورت کو اس حال میں دکھایا گیا ہے کہ وہ نہا کر غسل خانہ سے نکلی

ہے اور اس کے جسم پر بھیگا ہوا کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس مجسمہ کو اس قدر فن کاری کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سچ مچ کوئی بھیگے کپڑے میں کھڑا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا: اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر آرٹ کو تخلیق کرنے کی یہ نادر صلاحیت شاید اس لیے رکھی ہے کہ آدمی خالقِ اصغر کو دیکھ کر خالقِ اکبر کا تصور قائم کر سکے۔

حیدر آباد کے ریاستی دور میں جو شخصیتیں ابھریں ان میں سے ایک ہیں نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی (- ۱۸۴۲) وہ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ اردو کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی زبانیں بھی بخوبی جانتے تھے۔ حیدر آباد ریاست میں وہ مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ آخر میں وہ ناظمِ تعلیمات تھے۔ ۳۰ سال سے زیادہ مدت تک وہ ریاست کے تعلیمی امور کے ذمہ دار اعلیٰ رہے۔ بہت سے اعزازات و خطابات سے سرفراز کیے گیے۔ ۱۹۱۰ میں انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی شروع کیا تھا۔ مگر وہ نصف قرآن سے زیادہ نہ ہو سکا۔

نواب عماد الملک نہایت صاف گو آدمی تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی کتاب "چند ہم عصر" میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ سابق نظامِ دکن میر محبوب علی خاں نے اعلیٰ ارکانِ سلطنت سے پوچھا کہ عوام کا ان کی نسبت کیا خیال ہے۔ ہر ایک نے تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ نواب عماد الملک خاموش رہے۔ مکرر دریافت کرنے پر فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پیئے ہوئے پڑے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ نظامِ دکن نے ان کی اس راست گوئی کو پسند کیا اور اس کے صلہ میں ان کو الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی۔

میر محبوب علی خاں کے بعد ان کے صاحبزادے میر عثمان علی خاں ۱۹۱۱ میں حیدر آباد کے فرماں روا مقرر ہوئے اور خاتمہ ریاست (۱۹۴۸) تک اس کے فرماں روا رہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے نواب عماد الملک کا دوسرا قصہ اس طرح لکھا ہے کہ ایک بار نواب میر عثمان علی خاں (آخری فرماں روائے دکن) نے مسئلہ ازدواج پر بحث کے دوران کہا کہ اسلام میں تعدد ازواج کے بارہ میں سہولت ہے۔ نواب عماد الملک نے فوراً ٹوکا اور کہا کہ اسلام نے اس معاملہ میں ایسی کڑی شرط لگا رکھی ہے کہ کوئی شخص ایک سے زاید بیوی نہیں رکھ سکتا۔ شاہ دکن اس

صاف گوئی پر خفا ہو گیے۔ اس وقت وہ ڈنر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہِ دکن نے اسی وقت ان کو ڈنر کی میز سے اٹھا دیا۔

نواب میر عثمان علی خاں نے اپنے ایک ماتحت کو کھانے کی میز سے اٹھا دیا۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ بہت جلد وہ خود حکمرانی کی میز سے اٹھائے جانے والے ہیں تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔ سرکشی کے تمام واقعات صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے مستقبل سے بے خبر رہتا ہے۔ آدمی اگر اپنے مستقبل کو جانے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔

حیدر آباد کی تاریخ میں ایک نہایت اہم سبق ہے۔ ریاست کے دور میں یہاں وزیر اعظم کے عہدہ پر اکثر کوئی ہندو شخصیت ہوتی تھی۔ مثلاً ایک زمانہ میں مہاراجہ سرکشن پرشاد (وفات ۱۹۴۰) ریاست کے صدر اعظم تھے۔ وہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ تاہم اس سے نیچے کی ملازمتوں میں عام طور پر مسلمان لیے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی معاش کا واحد سب سے بڑا ذریعہ سرکاری ملازمت ہی تھی۔

یہ صورت حال ریاست کے ہندوؤں کے لیے ڈِس ایڈوانٹج کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر یہ ڈِس ایڈوانٹج ان کے لیے ایڈوانٹج بن گیا۔ سرکاری ملازمت سے مایوس ہو کر انھوں نے تجارت کے میدان میں اپنی کوشش شروع کر دی۔ یہاں تک کہ وہ ریاست کی تقریباً پوری تجارت پر قابض ہو گیے۔ یہ مثال ظاہر کرتی ہے کہ ہر محرومی میں ایک نئی شاندار تر کامیابی کا پہلو موجود ہوتا ہے، بشرطیکہ آدمی اس کو دریافت کرے اور اس کی طرف اپنی زندگی کا سفر شروع کر دے۔

حیدر آباد کے سفر کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ اس کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔ ۱۵ فروری کی شام کو میں باغ عامہ میں تقریر کر کے نکلا۔ لوگ مصافحہ کرنے کے لیے ہر طرف گھیرے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان بھیڑ کو چیرتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک آپ کی سب سے بہتر تصنیف کون ہے۔ میں نے کہا: میری سب سے بہتر تصنیف آپ ہیں۔ یہ انسان جو میرے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ یہی میری سب سے بہتر تصنیف ہے۔ میرا یہ جواب سن کر وہ ایک لمحہ کے لیے چپ رہا، اس کے بعد بولا: جب آپ مجھ کو اپنی سب سے بہتر تصنیف

کہتے ہیں تو میں بھی اس تصنیف کو طبع کر کے دکھاؤں گا۔

یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگیے۔ میں نے کہا کہ خدایا، تو اس نوجوان کے الفاظ کو پورا کر، اور ایسی بہت سی زندہ تصنیفیں تیار کر دے جو میرے مشن کو لے کر چلیں اور میرے بعد اس کو آگے بڑھائیں۔

حیدر آباد میں قارئین الرسالہ کا کافی بڑا حلقہ ہے۔ ان لوگوں نے یہاں ایک خاص کام "بک اسٹال" کا شروع کیا ہے۔ وہ ہر ہفتہ میں کم از کم دو بک اسٹال ضرور لگاتے ہیں۔ ایک جمعہ کے دن جامع مسجد کے سامنے۔ دوسرا اتوار کے دن باغ عامہ کے ہفتہ وار جلسہ میں۔ یہ طریقہ نہایت مفید ہے۔ دوسرے مقامات کے لوگوں کو بھی اس کی تقلید کرنی چاہیے۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں آپ کا سفر نامہ چھپتا ہے۔ اگر ہم سفر نامہ لکھیں تو کیا وہ الرسالہ میں چھپ سکتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ الرسالہ کا سفر نامہ دراصل سبق نامہ ہوتا ہے۔ اگر آپ بھی اسی طرح سبق نامہ لکھیں تو انشاء اللہ وہ بھی شائع ہو جائے گا۔

مسٹر پریم مرارکا (صنعت کار) کو اپنے ایک مسلم دوست سے انگریزی الرسالہ ملا۔ وہ ان کو اتنا پسند آیا کہ وہ اس کے باقاعدہ قاری ہو گیے۔ وہ مجھ سے ملے تو انھوں نے بتایا کہ ان کے کئی ہم قوم افراد نے الرسالہ کو دیکھ کر کہا کہ اس کو ہمارے نام بھی جاری کر دو۔ چنانچہ ان کے ذریعہ کئی اور ہندو صاحبان الرسالہ انگریزی کے قاری بن گیے ہیں۔ مسٹر مرارکا نے کہا کہ الرسالہ کے پہلے پیج پر آپ دو سطر یا تین سطر کی جو بات لکھتے ہیں وہ ایسی ہوتی ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد آدمی اس سے رک نہیں سکتا کہ وہ آگے نہ پڑھے۔

مسٹر مہادیون ریڈی (حمایت نگر) پہلے ایک بڑے سرکاری عہدہ پر تھے۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اردو زبان بخوبی جانتے ہیں۔ وہ الرسالہ کے باقاعدہ قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ تذکیر القرآن جلد اول کو پانچ بار پڑھ چکے ہیں اور اب اس کو چھٹی بار پڑھ رہے ہیں۔ تذکیر القرآن کی دوسری جلد کا انھوں نے شدت سے تقاضا کیا۔

مسٹر عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ کی رہائش گاہ پر کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مجلس ہوئی اس گفتگو کے دوران جو باتیں معلوم ہوئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ۱۹۴۸ میں جب ریاست

کا خاتمہ ہوا تو یہاں کے مسلمان بہت پریشان ہوئے۔ کیوں کہ اس وقت تک ان کی معاشیات کا انحصار زیادہ تر سرکاری ملازمت پر تھا اور ریاست کے ختم ہونے کے بعد وہ ملازمتوں سے محروم ہوگیے۔ اس طرح وقتی طور پر تو انھیں سخت تکلیف ہوئی۔ مگر اس محرومی نے انھیں بلند تر کامیابی تک پہونچا دیا۔ ملازمت کے میدان میں راستہ بند پاکر وہ تجارت کے میدان میں داخل ہونے لگے۔ اب چالیس سال کے بعد حیدر آباد کی تجارت میں مسلمانوں کا قابلِ لحاظ حصہ ہو چکا ہے، جب کہ ریاست کے زمانہ میں یہاں کی تجارت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔

اکثر لوگ جانتے ہیں کہ وہ انفرادی ناکامی کو کس طرح دوبارہ کامیابی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس انفرادی تجربہ کو ملّی اور اجتماعی معاملات میں استعمال کرنا جانتے ہوں۔

الرسالہ (جنوری ۱۹۸۷) میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے "یہ اسلام نہیں"۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی اس روش پر تنقید کی گئی ہے کہ کسی آدمی کی ایک بات کو غلط قرار دے کر اس کی جائداد کو جلانے پھونکنے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں متعدد واضح آیتوں کے حوالے بھی دیئے گیے ہیں۔ ایک صاحب نے اس مضمون پر اعتراض کیا۔ مگر انھوں نے قرآن یا حدیث کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ مذکورہ مضمون میں جو بات کہی گئی ہے وہ قرآن و حدیث کی دلیل کے ساتھ کہی گئی ہے۔ آپ قرآن و حدیث کو قرآن و حدیث سے کاٹ سکتے ہیں نہ کہ اپنے خود ساختہ الفاظ سے۔

یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا عام انداز ہے۔ کسی بات کے حق میں خواہ قرآن و حدیث کے کتنے ہی دلائل پیش کر دیجئے۔ وہ اس کی تردید کے لیے اس کو کافی سمجھیں گے کہ اپنے خود ساختہ "دلائل" پیش کر دیں۔ حالاں کہ قرآن و حدیث کو اپنے خود ساختہ "دلائل" کے ذریعہ رد کرنا سراسر فعل حرام ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ قرآن و حدیث کے جواب میں قرآن و حدیث پیش کرے ورنہ خاموش رہے۔

کشن جیونت راؤ پاٹل (عمر ۴۴) اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ناندیڑ سے آئے تھے۔ وہ الرسالہ اردو بالکل شروع سے پڑھتے ہیں اور اس کا مکمل فائل نمبر اسے محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ ان کی مادری

زبان مرہٹی ہے۔ وہ پہلے ایک لفظ اردو نہیں جانتے تھے۔ جولائی ۱۹۷۵ میں ان سے میری پہلی ملاقات ناندیڑ میں ہوئی تھی۔ ان سے کئی مفید گفتگوئیں ہوئیں۔ میں نے کہا کہ میں ایک اردو ماہنامہ نکالنے والا ہوں۔ وہ اتنے متاثر تھے کہ انھوں نے یہاں ۱۵ فروری کی ملاقات میں بتایا کہ جیسے ہی آپ میرے وطن (ناندیڑ) سے روانہ ہوئے، میں نے اسی وقت اردو سیکھنے کے لیے ماسٹر کا انتظام کیا تاکہ جب الرسالہ نکلے تو میں اس کو براہِ راست پڑھ سکوں۔ چنانچہ اب وہ الرسالہ کو صد فی صد براہِ راست اردو سے سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ایک اور شخص گنگا دھر ملاگرڈ (عمر ۴۰) کو بھی لائے تھے۔ وہ اردو ایک لفظ پڑھ نہیں سکتے۔ تاہم وہ ان کو الرسالہ کے مضامین پڑھ کر سناتے ہیں اور مرہٹی زبان میں ان کے سامنے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ الرسالہ سے آپ کو کیا خوراک ملی۔ انھوں نے کہا کہ "الرسالہ سے سوچنے کا ذہن بدل گیا"۔ پہلے میں ایک جانور کی طرح تھا۔ میرا مقصد تھا کہ کماؤ کھاؤ، اب الرسالہ پڑھنے سے مجھے زندگی کا مقصد مل گیا۔ کشن پٹیل صاحب نے اردو سیکھنے کے لیے بے پناہ محنت کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کے الفاظ اور حروف تہجی کو میں گھنٹوں یاد کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے جبڑوں میں درد پیدا ہو گیا۔ وہ نہایت سمجھ دار اور محنتی آدمی ہیں۔ دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔

حبیب بھائی نے کہا کہ میں ایک آفس میں گیا۔ وہاں دیوار پر ایک قدرتی منظر کی تصویر تھی، اس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ اگر تم میری خاموشی کو نہیں سمجھ سکتے تو تم میرے الفاظ کو بھی ہرگز نہیں سمجھو گے:

If you don't understand my silence,
you will never understand my words.

یہ قول بہت بامعنی ہے۔ الفاظ کسی حقیقت کا نہایت کم تر اظہار ہوتے ہیں۔ کسی حقیقت کی گہرائی کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو الفاظ سے زیادہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جن کے لیے خاموشی بول بن جائے۔ جو بین السطور کو بھی اسی طرح پڑھ لیں جس طرح کوئی شخص سطور کو پڑھتا ہے۔

حبیب بھائی نے بتایا کہ ہمارے دادا یہ کہا کرتے تھے کہ ہر روز کوئی نئی بات سیکھا کرو خواہ وہ گرہ دینے کا نیا طریقہ کیوں نہ ہو۔ یہ بہت گر کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں ٹھہراؤ نہیں۔ آدمی یا تو نیچے گرے یا اوپر اٹھے گا۔ ایسی حالت میں اپنے ارتقار کو باقی رکھنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ آدمی ہر روز کوئی نئی بات دریافت کرے، وہ اپنے ذہنی سفر کو مسلسل جاری رکھے۔

حیدرآباد کی تقریریں اور گفتگوئیں زیادہ تر چند قسم کے موضوعات پر رہیں۔ اول، ایمانیات کو جگانا۔ قرآن وحدیث کے جو درس ہوئے ان سب کا انداز یہی تھا۔ دوم، اسلام اور عصر حاضر۔ اس عنوان کے تحت یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ اسلام ایک ابدی دین ہے۔ زمانہ کی ترقیاں اس کی صداقت کو مزید واضح کرتی جارہی ہیں۔ سوم، تعمیر ملت۔ اس عنوان کے تحت یہ بتایا گیا کہ مسلمانوں کے لیے اس ملک میں راہیں بند نہیں ہیں۔ بلکہ پوری طرح کھلی ہوئی ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ حالات کو سمجھ کر ہوش مندی کے ساتھ کام کیا جائے۔ چہارم، اسلامی دعوت۔ اس سلسلہ میں خصوصی طور پر یہ واضح کیا گیا کہ مسلمان اور دیگر اقوام کا رشتہ داعی اور مدعو کا رشتہ ہے نہ کہ حریف اور رقیب کا رشتہ۔ ہمیں دوسری اقوام کی ہدایت کا حریص ہونا چاہیے۔ نہ کہ ہم ان کو دشمن سمجھ کر ان سے نفرت کریں یا ان کے خلاف بددعا دیں۔ میں نے کہا کہ مدعو پر اتمام حجت کے بغیر جو بددعا کی جائے وہ کبھی قبول ہونے والی نہیں، خواہ سو برس تک ایسی دعا کی جائے اور خواہ تمام اصاغر اور اکابر اس پر آمین کہہ رہے ہوں۔

۱۴ فروری کو پریس کانفرنس تھی۔ ابتداءً میں نے ملکی حالات پر تبصرہ کیا اور اس ذیل میں اسلامی مرکز کے مقاصد بیان کیے۔ اس کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا جو دیر تک قائم رہا۔

دوسری باتوں کے علاوہ میں نے ایک بات یہ کہی کہ نیشنل پریس میں ہندستان کے مسلمانوں کی تصویر بہت ادھوری شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ٹائمس آف انڈیا (۳ جنوری ۱۹۸۷) میں ہندستانی مسلمانوں کو شوروغل کرنے والا گروہ (Clamorous group) بتایا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات بذات خود غلط نہیں ہے۔ مگر اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں تھوڑے سے جو شوروغل کرنے والے لوگ ہیں انھیں کو نیشنل پریس میں نمایاں کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ

مسلمانوں کا زیادہ بڑا طبقہ وہ ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے تعمیری کاموں میں لگا ہوا ہے۔ مگر اس کو نیشنل پریس میں نمایاں نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ غالباً موجودہ صحافت کا انداز ہے۔ کیوں کہ ہمارے اخبارات میں تخریبی واقعات کو زیادہ جگہ دی جاتی ہے۔ "سیف لینڈنگ" آپ کے نزدیک خبر نہیں۔ لیکن "ہائی جیکنگ" ہو تو وہ آپ کے نزدیک خبر بن جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں میں نے مسلمانوں کی کئی تعمیری سرگرمیوں کی مثالیں دیں۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ ہمارے عربی اور دینی مدارس ایک عظیم الشان تعمیری کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ لاکھوں نوجوانوں میں اخلاقی شعور پیدا کرتے ہیں اور اس طرح ملک میں اخلاقی روایت کو باقی رکھنے کا واحد سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ ہمارے مدارس کا پڑھا ہوا آدمی جب باہر آتا ہے تو بازار میں، بس اور ٹرین میں اور مختلف عوامی مواقع پر وہ اخلاقی انضباط کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس طرح وہ ملک میں گرتی ہوئی اخلاقی قدروں کو بحال کرنے کا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مگر ملکی اخبارات کو پڑھنے والے لوگ اس واقعہ سے بالکل بے خبر ہیں۔ اسی طرح تبلیغی جماعت نے لاکھوں لوگوں کو خارجی جھگڑوں سے ہٹا کر اندرونی اصلاح کی طرف متوجہ کیا ہے۔ مگر اخباربیں طبقہ کو اس کی کوئی خبر نہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ اخباروں میں صفحہ اول کی سُرخی نہیں بنتے۔ میں نے کہا کہ ہمارے اخبارات کو مسلمانوں کی صحیح تصویر پیش کرنی چاہیے۔

حیدرآباد کے علاوہ محبوب نگر میں بھی اجتماعات ہوئے۔ ان کا نقشہ اگلے صفحہ پر درج ہے یہاں کا ہر اجتماع خدا کے فضل سے کافی کامیاب رہا۔ خاص طور پر تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ بڑی تعداد میں شریک رہا۔ لوگوں نے بتایا کہ جو افراد ان اجتماعات میں آئے وہ عام طور پر مسلم مقررین کے اجتماع میں کبھی دیکھے نہیں جاتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملت کا اعلیٰ ذہن نہایت سنجیدگی کے ساتھ اسلامی مرکز اور الرسالہ کی دعوت کا مطالعہ کر رہا ہے۔

یہاں کے اجتماعات اور تقریروں کی رپورٹیں مقامی اخبارات رہنمائے دکن، سیاست اور منصف وغیرہ میں روزانہ تفصیل کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ ایک صاحب ایک روز روزنامہ سیاست (۱۵ فروری ۱۹۸۷) کا ایک پرچہ لے آئے۔ اس میں میری ایک تقریر شائع ہوئی تھی۔ رپورٹر نے اس کی سُرخی حسب ذیل الفاظ میں قائم کی تھی:

مذکورہ بزرگ نے کہا کہ اس قسم کی سرخیاں صرف آپ کی دین ہیں۔ ورنہ ہمارے اخبارات عام طور پر اس قسم کی تعمیری سُرخیوں سے خالی ہوتے ہیں۔

۱۶ فروری کو محبوب نگر (مدرسہ سراج العلوم) میں ایک پروگرام تھا۔ یہاں "اسلام اور عصر حاضر" کے موضوع پر ایک مفصل تقریر ہوئی۔ شہر کا باشعور اور تعلیم یافتہ طبقہ بڑی تعداد میں جمع تھا۔ بعد کو ایک صاحب نے بتایا کہ لوگ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔

محبوب نگر کے پاس برگد کا ایک پرانا درخت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تقریباً چار سو سال پرانا ہے۔ اس درخت کا نام پہلے "پیر لامری" تھا۔ اب اس کا نام پِلا لامری (Pillalamarri) ہے۔ ہم لوگ اس کو دیکھنے کے لیے گیے۔ یہ گویا ایک درخت کا باغ ہے۔

پروگرام حیدرآباد

۱۴ فروری ۱۹۸۷	پریس کانفرنس	ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ	اسٹیشن روڈ
	افتتاح الرسالہ بک اسٹال و لائبریری	اعظم منزل	کنگ کوٹھی
	خطاب عام (تعمیر ملّت)	لطیف الدین ہال	حمایت نگر
۱۵ فروری	درس قرآن بعد نماز فجر	مسجد دار القرآن	لال ٹیکری
	خطاب عام	اردو گھر	مغل پورہ
	تقریر سیرت	دکن میڈیکل کالج	نارائن گوڑہ
	عام ملاقات	رہائش گاہ محمد حسام الدین صاحب	حمایت نگر
	خطاب عام بعد نماز مغرب (اسلام اور عصر حاضر)	مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ	باغ عامہ
۱۶ فروری	درس قرآن	مسجد سلطان نواز جنگ	آغا پورہ
	درس حدیث	مسجد سلیمہ خاتون	حمایت نگر
	خطاب عام (دعوت اسلامی کے جدید امکانات)	مدرسہ سراج العلوم	محبوب نگر
۱۷ فروری	درس قرآن	مسجد سراج العلوم	محبوب نگر

یہ اگرچہ ایک ہی درخت ہے۔ مگر وہ اس طرح پھیل پھیل کر زمین میں اگا ہے کہ ایک درخت کئی درخت معلوم ہونے لگا ہے۔

اس علاقہ کو از سر نو منظم کیا جا رہا ہے۔ کلکٹر نے ہندوؤں اور عیسائیوں اور مسلمانوں سے کہا کہ یہاں ہم ہر مذہب کے لیے زمین دیں گے۔ آپ لوگ اپنے اپنے طرز پر یہاں عبادت گاہ بنائیں۔ ہندوؤں اور عیسائیوں نے اس کو فوراً قبول کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں جدید طرز کا ایک چرچ زیر تعمیر ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ مسلمان ابھی تک اس پیش کش کو استعمال نہ کر سکے۔ میرا اندازہ ہے کہ آئندہ یہ جگہ ترقی کرے گی اور یہاں کی زمینیں کافی مہنگی ہو جائیں گی۔ یہاں کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس موقع کو نہ کھوئیں۔ اگر انھوں نے بروقت اس موقع کو کھو دیا تو آئندہ یہاں مسجد کی تعمیر بے حد مشکل ہو جائے گی۔ یہاں سیاح آتے رہتے ہیں جن میں مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ نیز مقامی اداروں میں مسلمان کارکن بھی موجود ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کے لیے یہاں مسجد کی تعمیر بہت مفید ثابت ہوگی۔

محبوب نگر میں ایک مسلمان تاجر اپنی رائس مل دکھانے کے لیے لے گیے۔ انھوں نے جدید طرز کی مشینیں لگائی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ دھان کو چاول میں تبدیل کرنے کے لیے اس کو سات مرحلوں سے گزارنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ قدرت کا ایک سبق ہے۔ اس طرح قدرت تدریج کی اہمیت کو بتاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر کامیابی تدریجی طریق کار کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ چھلانگ کے ذریعہ یکایک اپنی منزل پر پہونچنا چاہیں وہ کبھی منزل مقصود کو نہیں پہونچتے۔

تاجر آدمی عملی آدمی ہوتا ہے، اس لیے وہ عملی باتوں کو بہت جلد سمجھ لیتا ہے۔ محبوب نگر کے ایک مسلمان تاجر نے کہا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا زیادہ یقینی حل یہ ہے کہ برادرانِ وطن سے اچھے تعلقات قائم کیے جائیں۔ حکومت کے خلاف تقریریں یا حکومت کے ارکان کی طرف دوڑ دھوپ سے زیادہ مفید اور اہم بات یہ ہے کہ برادرانِ وطن سے تعلقات بڑھائے جائیں۔ اپنی رائے کی تائید میں انھوں نے کئی واقعات بتائے۔

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ مسلمانوں نے حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں جتنی طاقت

صرف کی ہے، اتنی طاقت اگر وہ برادران وطن سے تعلقات استوار کرنے میں صرف کرتے تو اب تک ان کے تمام مسائل حل ہو چکے ہوتے۔

میں نے ایک گفتگو میں دعوت عام کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ مسلمان تو خود ہی اسلام سے دور ہیں، وہ دوسروں کو اسلام کی طرف کیا بلا سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ایک نہایت مہلک غلط فہمی ہے جو شیطان نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ذہن میں ڈال رکھی ہے۔ کوئی شخص مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام قبول نہیں کرتا بلکہ حق کو دیکھ کر اسلام قبول کرتا ہے۔ میں نے یوسف اسلام (انگریز) اور دوسرے بہت سے نومسلموں کے حالات کو جاننے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہر ایک نے یہ جانتے ہوئے اسلام قبول کیا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی حالت بہت گر چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص مسلمانوں کے لیے اسلام قبول نہیں کرتا بلکہ اس لیے اسلام قبول کرتا ہے کہ اسلام کی ابدی سچائی کے ساتھ وہ اپنے آپ کو وابستہ کر سکے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے اوپر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ آپ کو بھارت سرکار سے روپیہ ملتا ہے تاکہ آپ مسلمانوں کو ڈیموراالائز کریں۔

میں ابھی خاموش تھا کہ مجلس کے ایک صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ آپ تو الٹی بات کہہ رہے ہیں۔ الرسالہ تو مسلمانوں کے مورال کو بلند کر رہا ہے۔ پھر کیا آپ کا خیال ہے کہ بھارت سرکار یہ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کے مورال کو بلند کیا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آپ الرسالہ کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ الرسالہ مسلم نوجوانوں کو اٹھانا چاہتا ہے، وہ مسلم نوجوانوں کے اندر ہیرو انہ کردار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تحریک کسی کی مدد سے چلے تو مدد دینے والے کے خلاف ہیرو نہیں بنائے جاتے۔ بلکہ ایک نااہل قوم تیار کی جاتی ہے۔ اسلامی مرکز کی مطبوعات کا ایک ایک صفحہ مسلم نوجوانوں کی کردار سازی کرتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ ان کو ہیرو بنا رہا ہے۔ وہ ان کے اندر اعلیٰ اخلاقی جذبہ ابھارنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے اندر صحیح اسلامی فکر پیدا کر رہا ہے۔ پھر کیا بھارت سرکار کی خواہش یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی مرکز کے خلاف اس قسم کا پروپیگنڈا کرنے والے لوگ خود وہ کام کر رہے ہیں جس کا الزام

وہ اسلامی مرکز پر لگاتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو تعمیری مہم سے ہٹا کر تخریبی رخ پر ڈالنا چاہتے ہیں جو یقینی طور پر صرف بربادی کا راستہ ہے۔

۱۷ فروری ۱۹۸۷ کی شام کو فلائٹ نمبر ۵۳۹ کے ذریعہ دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔ راستہ میں میری سیٹ سے ملی ہوئی سیٹ پر مسٹر ڈی پی گپتا تھے۔ وہ بھارت ہیوی الکٹریکلس لمیٹڈ (BHEL) میں جنرل منیجر (ٹرانس میشن) ہیں۔ پورے راستے میں ان سے باتیں ہوتی رہیں۔

ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ نہایت لائق افسر ہیں اور انتہائی دیانت اور محنت کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔ مزید سوالات کے دوران معلوم ہوا کہ اس کی خاص وجہ ان کا مذہبی بیک گراؤنڈ ہے۔ ان کے والد نہایت قابل آدمی تھے۔ وہ انگریزی اور ہندی کے علاوہ عربی اور فارسی بھی جانتے تھے۔ حتی کہ قرآن کے کئی حصے کا انھوں نے حافظہ کیا تھا اور ان کو پڑھتے رہتے تھے۔ خود مسٹر گپتا بھی اچھی اردو جانتے ہیں۔

اس گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ موجودہ زمانہ میں دفتروں میں کارکردگی گھٹنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ نئی نسلیں مذہبی اور روحانی روایات سے کٹ گئیں۔ جدید نسل کو دوبارہ امانت دار اور محنتی بنانے کی واحد شکل یہ ہے کہ از سر نو سماج کے اندر مذہبی اور روحانی روایتیں قائم کی جائیں۔ اس مسئلہ کا اس کے سوا کوئی دوسرا حل نہیں۔

دوسری بات یہ کہ پچاس برس پہلے کے ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اتنے اچھے تھے کہ ہندو عربی اور فارسی زبانیں پڑھتے تھے۔ حتی کہ قرآن کی سورتیں یاد کرتے تھے۔ نادان قسم کے مسلم لیڈروں کی سیاست نے اس فضا کو بالکل برباد کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں بعض اوقات ناخوش گوار واقعات پیش آتے تھے۔ مگر ایسے واقعات ہر سماج میں اور ہمیشہ پیش آتے ہیں۔ یہ واقعات یقینی طور پر انفرادی ہوتے تھے اور ضروری تھا کہ ان محدود واقعات کو محدود دائرہ میں رکھ کر دیکھا جائے، ان کو بڑھا چڑھا کر قومی اور ملکی مسئلہ نہ بنایا جائے۔ مگر ہمارے نادان لیڈروں نے انتہائی غیر ذمہ دارانہ طور پر ان جزئی نوعیت کی باتوں کو اتنا بڑھایا کہ دونوں فرقوں کے درمیان ناقابل عبور دوری حائل ہو گئی۔ یہ غیر اہم باتوں کو اہم بنانا تھا۔ اور جو لوگ ایسا کریں ان کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ موجودہ دنیا میں کبھی کوئی بڑی کامیابی

اصل نہ کر سکیں۔

سفر سے واپسی کے بعد وہاں سے مختلف تاثراتی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ یہاں دو خط نقل کیے جاتے ہیں ـــــ مولانا محمد امیر اللہ خاں قاسمی (محبوب نگر) اپنے خط مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ میں لکھتے ہیں: آپ کی آمد مسلمانان محبوب نگر کے لیے غیر معمولی مسرت اور خوشی کا سامان ہوئی۔ دو گھنٹے کی طویل تقریر کو جس دل چسپی اور شوق سے سنا گیا، میری نظر میں محبوب نگر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے۔ تقریر کا غیر معمولی تاثر ہوا۔ باشعور اور سنجیدہ لوگوں نے پھر آپ کی آمد کا پروگرام بنانے کے لیے مجھے پابند کیا۔

آپ جس کام اور پیغام کو لے کر اٹھے ہیں وہ اس زمانہ کا نہایت ضروری کام ہے اور وقت کا اہم تقاضا بھی یہی ہے۔

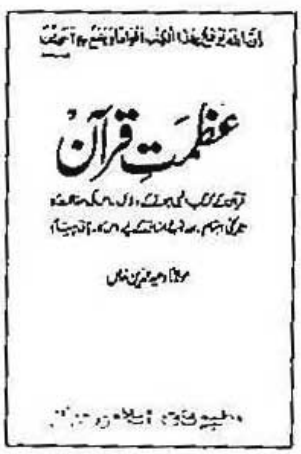

خدا کو پانا سب سے بڑی حقیقت کو پانا ہے۔ کوئی آدمی جب خدا کو پاتا ہے تو یہ اس کے لیے ایک ایسی دریافت ہوتی ہے جو اس کی پوری زندگی کو بدل دیتی ہے۔ وہ ایک ناقابل بیان ربانی نور میں نہا اٹھتا ہے، وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ، اس کا عمل اور اس کی تمام کارروائیاں ایک ایسے انسان کی کارروائیاں بن جاتی ہیں جو خدا کے ظہور سے پہلے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

ہدیہ: ۴۰ روپیہ

قرآن اپنی ذات میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ وہ اسی ابتدائی صورت میں کامل طور پر محفوظ ہے جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا۔ ان خصوصیات نے قرآن کے پیغام کو اتنا طاقتور بنا دیا ہے کہ جب بھی وہ دنیا کے سامنے اپنی اصلی شکل میں لایا جائے گا وہ اقوام عالم کو مسخر کر لے گا۔

ہدیہ: ۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ـــــ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

حیدرآباد میں ایک تین روزہ اجتماع ۱۴- ۱۵- ۱۶ فروری ۱۹۸۷ کو ہوا۔ اس موقع پر دہلی سے صدر اسلامی مرکز شریک ہوئے۔ وہاں موصوف کے کئی کامیاب پروگرام ہوئے۔ حیدرآباد کے علاوہ محبوب نگر میں بھی تقریر ہوئی۔ اس سفر کی مفصل روداد انشاءاللہ آئندہ الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔ ہر پروگرام میں تعلیم یافتہ طبقہ بڑی تعداد میں شریک ہوا۔

۷ فروری ۱۹۸۷ کو نئی دہلی (گول مارکیٹ) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت کی۔

ایک سفر کے دوران صدر اسلامی مرکز کو بمبئی اور اعظم گڈھ جانا ہوا۔ دونوں مقامات پر کئی دعوتی پروگرام (۲۵ فروری۔ ۲ مارچ) ہوئے۔ ان کی تفصیل روداد سفر میں آئندہ شائع کردی جائے گی۔

قارئین الرسالہ میں ایک رجحان بہت تیزی سے ابھرا ہے۔ اور وہ ہے اپنے غیر مسلم دوستوں کے نام الرسالہ انگریزی جاری کرنا۔ یہ دعوتی جذبہ بے حد قابلِ قدر ہے۔ ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس طریقہ کو اپنائیں، تاکہ ہمارے اوپر برادرانِ وطن کی نسبت سے جو دعوتی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ ادا ہوسکے۔

ایک صاحب لکھتے ہیں "خاتون اسلام" کا از اول تا آخر نہایت شوق سے مطالعہ کیا۔ آپ کا تجزیاتی انداز بیان، سائنٹفک طرزِ استدلال اور موثر اسلوب نگارش غیر معمولی ہے۔ پوری کتاب معلومات افزا اور دلچسپ ہے۔ جدید دور کے لحاظ سے اس کے ابواب خاص طور پر متاثر کن ہیں۔ کتاب جدید معیار تعقل پر پوری اترنے کے ساتھ اپنے موضوع پر منفرد اور جامع ومانع ہے (عبدالحمید قاسمی)

ایک خاتون لکھتی ہیں: میں نے جو بھی کتاب آپ کی پڑھی تو نہ جانے میرے دل میں آخرت کا سوال اس طرح اٹھتا ہے جیسے گرم تیل کو پانی میں دینے کے وقت ہوجاتا ہے۔

میں ہمیشہ یہ سوچتی تھی کہ آپ کو خط ارسال کروں، اب جب کہ میں نے آپ کی کتاب زلزلہ قیامت پڑھی تو میرا قلم آپ کو یہ خط لکھنے پر مجبور ہوگیا (کنیز فاطمہ)

ایک صاحب جدہ سے لکھتے ہیں "ہم سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگانے کے لیے الرسالہ جیسے ہی ایک پرچہ کی ضرورت تھی۔ آپ کی تحریریں دل کے تاروں کو چھولیتی ہیں۔ آپ عصری اسلوب میں اسلام کے تعلق سے اتنے سائنٹفک مضامین کس طرح لکھتے ہیں۔ جب مجھے الرسالہ ملتا ہے، اس کے دوسرے گھنٹہ میں ہی سارا رسالہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر غور و فکر کے لیے بار بار پڑھتا ہوں۔ آپ کے اس مختصر پرچہ میں ایسی غیر معمولی مقناطیسی طاقت ہے کہ جو ایک مرتبہ پڑھ لیتا ہے پھر اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اس پرچہ کو جدہ میں ایک دوست کے پاس دیکھا، اس کے دوسرے دن میں اس کا مستقل خریدار بن گیا۔ جو بھی میرے پاس سے پرچہ لے کر جاتا ہے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آئندہ سال کے لیے میں اپنی خریداری کی تجدید کے ساتھ دو نئے ممبر بھیج رہا ہوں جو اس پرچہ سے اور آپ کی حکمت و نصیحت سے، بھرپور تحریروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ کے پرچہ سے یہاں بہت سارے لوگ متاثر ہیں اور میرے پاس سے لے کر مطالعہ کرتے ہیں (۲۸ دسمبر ۱۹۸۶)

ایک صاحب سعودی عرب سے لکھتے ہیں: تذکیر القرآن کی دوسری جلد کی سخت ضرورت ہے۔ تذکیر القرآن کی پہلی جلد ہم چند لوگ یہاں روزانہ عشاء کی نماز کے بعد پڑھتے ہیں۔ اور کافی اثر قبول کرتے ہیں۔ سب ہی یہ محسوس کرتے ہیں کہ تذکیر القرآن واقعی تذکیر القرآن ہے۔ مختصر اور کھلے الفاظ میں ہمیں قرآن کا بنیادی مطلب مل جاتا ہے۔ (۲۱ فروری ۱۹۸۷)

اسلامی مرکز کے مشن کے خلاف حال میں کچھ لوگوں نے بے بنیاد مضامین شائع کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خط کا جواب دیتے ہوئے صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ یہ بالکل لغو باتیں ہیں اور لغو کے بارہ میں ہمیں اعراض کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کا بہترین جواب یہ ہے کہ ان کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

امیتوا الباطل بالصمت عنه (باطل کو ہلاک کرو اس کے بارے میں چپ رہ کر)۔

۱۰۔ الرسالہ انگریزی کا ہر طبقہ میں غیر معمولی استقبال کیا جارہا ہے۔ انگلستان کی ایک تعلیم یافتہ خاتون نے حسب ذیل الفاظ میں اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے :

I came across the Al-Risala (English) in September 1986, and have been a regular reader since then. It is intelligible. I can understand all that is being said. The language is excellent. I have read several books on Islam, but I found them badly written and unintelligible.
Ms Alexandra, 10 Horn Hill Road,
Adderbury West, Banbury, Oxon Ox16 3EW, England.

۱۱۔ ایک امریکی نومسلم جو ملیشیا میں ایک ادارہ کے دائرکٹر ہیں، وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

Thank you for continuing to forward Al-Risala (English) which has such a refreshing and unique approach to Islam. I wish other Muslims would imitate your positive approach.
Hj. Fadlullah Wilmot,
No. 8 Lorong SS 1/11A, Kampung Tunku
Petaling Jaya, Selangor, Malaysia.

۱۲۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان اپنے خط میں انگریزی الرسالہ کے بارہ میں لکھتے ہیں :

It was a great delight to read two issues of Al-Risala (English). The size does not restrict the content. The editorial (issue 36) 'Is this Islam' is very timely and reasonable and also speaks of a modern, truthful and sympathetic mind so much required today. Al-Risala is a very good venture and I wish it not only to be successful but also useful.
Ameeq Hanfee, A-223 Pandara Road, New Delhi 110003

۱۳۔ انگریزی الرسالہ کے ایک قاری کرناٹک سے لکھتے ہیں :

I have been a regular reader of Al-Risala (English) from the past one year. I thoroughly enjoy reading its contents, and the comparisons it puts forth essentially requires commendable appreciation. It upholds the true tenets of Islam. In fact, no month is ever complete for me without an issue of Al-Risala monthly magazine.
Mohamed Razick Sait,
Oorgaum, Kolar Gold Fields 563120 (Karnataka)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

'Introduction to Islam' Series

1. The Way to Find God
2. The Teachings of Islam
3. The Good Life
4. The Garden of Paradise
5. The Fire of Hell

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. The first pamphlet shows that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet is an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of Paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to Hell-fire.

Price per set: Rs 24.00

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi 110013

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76 April 1987 No. 125

خاتونِ اسلام

اسلامی شریعت میں عورت کا مقام
اسلام اور جدید تہذیب کا تقابل

از: مولانا وحید الدّین خاں

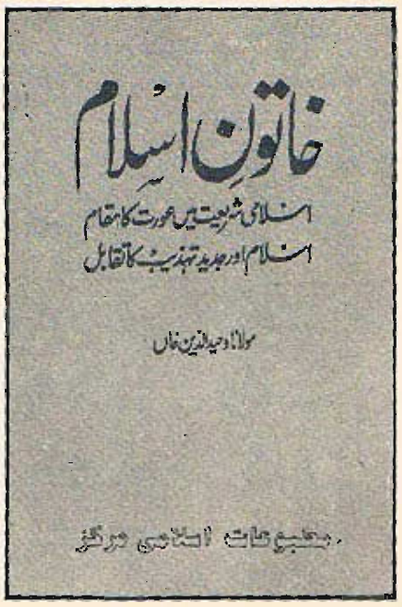

عورت کا درجہ اسلام میں وہی ہے جو مرد کا درجہ ہے۔ عزّت اور احترام کے جو احکام ایک صِنف کے لئے ہیں وہی احکام دوسری صِنف کے لئے بھی ہیں۔ دنیا کے حقوق اور آخرت کے انعامات میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ البتہ اسلام کے نزدیک مرد مرد ہے اور عورت عورت۔ زندگی کا نظام چلانے میں دونوں برابر کے شریک ہیں، تاہم فطری فرق کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام نے دونوں کے درمیان تقسیمِ کار کا اصول رکھا ہے نہ کہ یکسانیتِ کار کا اصول۔

(صفحات ۱۹۲، قیمت ۳۰ روپیہ)

مکتبہ الرسالہ
سی-۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی-۱۳ فون: 697333, 611128

Rs. 4